نیکی اور بدی کی جزا

وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اِذَا اَحْسَنَ اَحَدُكُمْ اِسْلَامَهٗ فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَّعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهٗ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ وَّكُلُّ سَيِّئَةٍ يَّعْمَلُهَا تُكْتَبُ بِمِثْلِهَا حَتّٰى لَقِيَ اللّٰهَ)) [متفق علیہ]

''سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنے اسلام کو اچھا بنائے گا، اس کی ہر ایک نیکی کا اجر دس گنا لکھا جائے گا تو یہاں تک کہ اس کی ایک ایک نیکی سات سو نیکیوں کے برابر ہو گی اور ہر ایک بدی اپنے مثل لکھی جائے گی یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس چلا جائے۔''

دین کے بنیادی اصول

ابوعبداللہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سنت کے بنیادی اصول ہمارے نزدیک یہ ہیں:

اصول نمبر 1:...... اَلتَّمَسُّکُ بِمَا کَانَ عَلَیْهِ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالْاِقْتِدَآءُ بِهِمْ.

"جس راہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام ہیں، اسے مضبوطی سے اپنانا اور صحابہ کرام کی پیروی کرنا"

بلاشبہ یہ سنت کے اہم ترین اصولوں میں سے ہیں، اس کے دلائل بہت زیادہ ہیں، مثلاً:

1: ﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَاتَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَسَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيْرًا﴾ [سورۃ النساء: ۱۱۵]

"جو ہدایت واضح ہو جانے کے بعد رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کریں اور مومنوں کے علاوہ (کسی کی) راہ پر چلیں، ہم انہیں اسی طرف موڑ دیں گے جس طرف وہ مڑے ہیں اور جہنم تک پہنچا دیں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔"

②: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو تم میں سے زندہ رہے گا وہ بہت اختلاف دیکھے گا، تم میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت مضبوطی سے تھامے رکھنا"۔

[سنن ترمذی: ۲۶۸۶۔سنن ابوداؤد: ۴۶۰۷۔سنن ابن ماجہ: ۴۲]

③: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جو راہنما بنانا چاہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو راہنما بنائے، کیوں کہ وہ اس امت میں دل کے اعتبار سے سب سے نیک، علم کے لحاظ سے سب سے گہرے، تکلف میں سب سے کم، ہدایت میں سب سے مضبوط، حالات میں سب سے اچھے تھے۔ انہیں اللہ تعالی نے اپنے نبی کا ساتھ دینے کے لیے پسند فرمایا، ان کی فضیلت پہچانو اور ان کے نقش قدم پر چلو، وہ لوگ ہدایت اور سیدھی راہ پر تھے۔

[جامع بیان العلم لابن عبدالبر: ۱۸۱۰]

شرح: امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا یہ رسالہ سنت کے اصول و مبادی کے متعلق ہے، یہ بات معلوم ہے کہ اصل اُسے کہا جاتا ہے جو کسی دوسری چیز کے لیے بنیاد ہو، یا اس سے شاخیں نکلتی ہوں، جیسے: دیوار کی بنیاد اور درخت کی جڑ ہوتی ہے۔ یعنی سنت کی کچھ بنیادیں ہیں جن سے مختلف مسائل نکلتے ہیں۔

اصول میں سب سے بنیادی بات کتاب اللہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل ہے۔ جب لوگوں کے لیے یہ بنیاد واضح ہوگئی، یعنی کتاب و سنت اور عملِ صحابہ پر عمل پیرا ہو گئے تو گویا انہوں نے ان اصول سے نکلنے والے پورے دین کو اپنا لیا۔

فہرست

السعی منّا والاتمام من اللّٰہ

اداریہ

حافظ احمد شاکر

الاعتصام کی باسٹھویں......62......جلد کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ کاشکر ہم کس طرح ادا کریں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر بھی شکر ادا کرنا چاہیں حق شکر ادا ہو ہی نہیں سکتا کہ دین حنیف کی یہ مدھم سی لو جلائے رکھنے کی اس نے ہمیں توفیق عطا فرمائی ہوئی ہے۔اس کی قبولیت عامہ کا اظہار قارئین کی محبت ان کی دلچسپی اوران کے اس انتظار سے کیا جاتا ہے کہ ڈاک کی خرابی کی بناپر جس دوست کو کبھی شمارہ نہ پہنچے یا اس کے نظر نواز نہ ہو تو یہ مخلصین فوراً شکایت کر کے اس کا تقاضا کرتے ہیں۔بعض فراخ دل علماء وخطباء خطبہ ہائے جمعۃ المبارک میں اس سے فیض پانے اور افادیت کا کھلے دل سے اعتراف بھی کرتے ہیں۔اس کے بہت سے قارئین اس کا باقاعدہ ریکارڈ یعنی فائل بھی رکھتے ہیں۔بعض اپنا جمع شدہ ریکارڈ ضائع کرنے کی بجائے دفتر الاعتصام پہنچا کر اس سے بے پایاں محبت کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔یہ سب علامتیں ہیں بارگاہِ الٰہی میں اس کی قبولیت کی جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل خاص کے ساتھ اس کے موسس کا اخلاص،اس کے معاونین کی لوجہ اللہ محبت ودعائیں اس کے کارکنان کی بے پایاں مخلصانہ محنت اور غیر معمولی قناعت کی جس پر ادارہ الاعتصام ان سب کا شکر گزار ہے۔جزاہم اللہ تعالیٰ وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء۔

جیسا کہ آپ سب حضرات کے علم میں ہے کہ ہفت روزہ الاعتصام دارالدعوۃ السّلفیہ کا ایک مستقل شعبہ ہے۔آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ نے ۱۹۸۰ء میں اعیانِ جماعت کی موجودگی میں دارالدعوۃ السّلفیہ کے قیام اور تاسیس کا اعلان کیا تھا جس کا مقصد مسلک محدثین کی اشاعت یعنی دین حنیف کو......علمی اور تحقیقی انداز میں......عامۃ المسلمین تک پہنچانا تھا کہ اس کے لیے بنیادی ضروریات......کتب،عمارت اور ماحول......اللہ تعالیٰ نے اس کے مؤسس کو ودیعت کر دی تھیں۔چناں چہ مولانا رحمہ اللہ نے یہ چہار منزلہ بلڈنگ اور اس کے اندر کتب،فرنیچر اور مختلف تنصیبات......اے۔سی، ٹیلی فون وغیرہ......سب کچھ وقف فرما گئے تھے۔ویسے تو اس کے تمام شعبے ہی اہم ہیں لیکن ہفت روزہ الاعتصام اس کا آرگن ہے اور عربی،اردو دو الگ منزلوں پر مشتمل لائبریری اور المجلس العلمی السّلفی اس کے اہم شعبے ہیں۔بحمد اللہ تعالیٰ وعونہ یہ لائبریری عوام الناس کے لیے باقاعدہ......صبح ۹ بجے سے ۴ بجے تک......کھلتی ہے جس سے ملک وبیرون ملک سے،جماعتی وغیر جماعتی اہل علم بلکہ غیر مسلم بھی استفادہ کرتے ہیں اور مختلف مدارس،کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء وطالبات جب استفادے کے لیے تشریف لاتے ہیں تو ہمارے رفقاء ان کی ہر ممکن خدمت بجالانے کی کوشش کرتے ہیں۔خصوصاً مطلوبہ کتب کو نکال کر دینا،بعض مرتبہ حوالے بھی تلاش کرتے اور بعض دفعہ تو حسب فرصت عبارتوں کے ترجمے کر کے بھی لائبریری کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ **تقبل اللہ سعیھم**

لائبریری کے حوالے سے قابل غور بلکہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہم نئی کتب کی خریداری ایک عرصے سے نہیں کر پا رہے کہ احباب جو گراں قدر تعاون فرماتے ہیں اس سے بمشکل رفقائے کار کے اعزازیوں اور الاعتصام کے اشاعتی اخراجات ہی پورے ہوتے ہیں۔تاہم اس کے مؤسس کے طریق کے مطابق ہم کسی کام کو ایشو نہیں بناتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پہ اعتماد کرتے ہوئے اس کے مقررہ وقت کا انتظار کرتے ہیں اور وقت آنے پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کا انتظام یقیناً فرما دیتا ہے۔

اسی طرح دارالدعوۃ السّلفیہ کا تیسرا اہم شعبہ ''المجلس العلمی السّلفی'' ہے۔جس کے ذریعے ادارے کے مقصد قیام یعنی مسلک محدثین کی اشاعت یعنی فکر اہل حدیث کے مطابق کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔دارالدعوۃ السّلفیہ کم وبیش اب تک 30 کتابیں شائع کر چکا ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ......۲۰۰۸ء......سال دارالدعوۃ السّلفیہ نے مشکوٰۃ شریف کی عربی شرح......تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث المشکوٰۃ......شائع کی تھی

سال گزشتہ......۲۰۰۹ء...... میں اولاً نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ کی خودنوشت ''جس کی پہلی اشاعت برادرم حافظ صلاح الدین نے کتابت کروا کر اہتمام سے شائع کی تھی۔اب اس کو کمپیوٹر کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

اس کے بعد دارالدعوۃ السّلفیہ کی مفید ترین اور معروف کتاب منتقی الاخبار جس کے دو ایڈیشن پہلے طبع ہو چکے تھے۔اس کی کمپوزنگ بھی نئی یعنی عربی متن بھی جدید لگایا گیا ہے یا نیز اس کا انداز طباعت...... جو پہلے ہر صفحہ پر نصف عربی اور نصف اردو تھا اور اب دائیں ہاتھ عربی متن مکمل صفحہ اور الٹے ہاتھ مکمل حسب متن اردو مکمل صفحہ......تبدیل کر کے اس کی تیسری طبع تیار کی گئی۔

۱۹۵۶ء میں مولانا محمد اسحاق بھٹی ﷾ نے بڑے اہتمام اور اشتیاق سے الاعتصام کا حجیت حدیث نمبر شائع کیا تھا جو بلاشبہ اس دور کا ایک عظیم کارنامہ اور مسلک محدثین کی اہم علمی خدمت تھی۔علماء و طلباء اور بعض شائقین کئی سال سے اس کی طبع جدید کے لیے اصرار کر رہے تھے وہ بھی الحمدللہ طبع ہو کر جلد بندی کے مراحل میں ہے۔''المجلس العلمی السّلفی'' کی یہ کارکردگی ہے بتوفیقہ تعالیٰ جس کی سعادت سے ہم بہرہ ور ہوئے۔تشکر بھرا یہ اظہار کرتے ہوئے ہم اطمینان و سکون محسوس کرتے ہیں کہ مذکورہ کتابوں کی اشاعت اللہ تعالیٰ کے فضل کے بعد ہمارے صدر گرامی کی خواہش کاوش اور نگرانی کی مرہون منت ہے کہ جب بھی ہم پر کاہلی اور سستی کا غلبہ ہونے لگتا۔مولانا ﷾ ہمیں خواب غفلت سے بیدار فرما دیتے۔جس پر مولانا کے شکر گزار بھی ہیں اور ان کے لیے دعا گو بھی کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کو صحت و عافیت کے ساتھ زندگی عطا فرمائے۔

محبین و مخلصین دارالدعوۃ السّلفیہ اور قارئین الاعتصام سے رابطے کا ذریعہ تو الاعتصام ہی ہے اس لحاظ سے دارالدعوۃ السّلفیہ کا ایک شعبہ ہونے کے باوجود یہ بذاتہ ایک الگ ادارے کی حیثیت رکھتا ہے۔برصغیر کی جماعت اہل حدیث کی تاریخ میں اس کو طول عمری کا شرف اسی کو حاصل ہے کہ اکسٹھ سال پورے کر کے باسٹھویں سال میں داخل ہو چکا ہے۔ماضی میں الاعتصام کو جو اساطین علم مرتب کرتے رہے جو عالی مقام علماء اس کے اداریے لکھتے رہے اور اپنے اپنے وقت کے اصحابِ علم اس میں مقالہ نویسی فرماتے اور مضامین لکھتے رہے۔موجودہ علمی انحطاط میں وہ تو شاید ممکن نہ ہو سکتا ہو لیکن ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ الاعتصام کے قارئین کرام اب بھی جس معیار کی ہم سے توقع رکھتے ہیں ہم اس کا حق بھی ادا نہیں کر پا رہے۔مضامین الاعتصام میں عموماً تین عناوین سے قارئین زیادہ تر مستفید ہوتے اور ان کے انتظار میں رہتے ہیں یعنی

درس قرآن جس کا کم و بیش دو سال سے تسلسل نہیں ہو پا رہا اس سال اس کے تسلسل و تواتر کا ارادہ رکھتے ہیں۔قارئین اس کے لیے استقامت کی دعا فرمائیں۔

درس حدیث پر تشنگی بھی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے اس کے لیے ہم مستقل سلسلہ شروع کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔اس کی کامیابی کے لیے بھی ہم قارئین سے دعا کے خواستگار ہیں۔

تیسری اہم چیز باب الفتاویٰ تھا۔جس کو ہمارے مخدوم و محترم مولانا حافظ ثناء اللہ عیسیٰ خاں ﷾ سالہا سال سے بڑے اخلاص اور شوق سے تحریر فرماتے تھے اور صحیح بات یہ ہے کہ الاعتصام کے ذریعہ ان فتاویٰ جات سے ہزاروں انسان فیض پاتے اور مستفید ہوتے تھے۔

اب کچھ عرصہ سے حافظ ﷾ کے علم کی اللہ تعالیٰ نے قبولیت قابل رشک حد تک عام کر دی ہے۔کہ کویت اور بعض دیگر مسلم ریاستوں میں طالبان علم حدیث ان سے مستفید ہونے کے لیے بے تاب رہتے ہیں اور حافظ صاحب حسب فرصت ان تشنگان علم کو سیراب کرنے کے لیے عموماً بیرون ملک سفر میں رہتے ہیں ایسے ہی حافظ صاحب ﷾ بعض یورپی ممالک میں فقہ و فتاویٰ کی بعض مجالس کے رکن رکین ہیں جس میں شرکت کے لیے انہیں سفر کرنا پڑتا ہے۔اس لیے حافظ صاحب کے اسفار اور واپس آ کر ان کی تھکن کی وجوہات کی بنا پر کچھ عرصہ سے باب الفتاویٰ میں تسلسل نہیں رہ سکا۔اس سال ہماری کوشش قارئین کی اس تشنگی کو کسی نہ کسی طریقہ سے دور کیا جائے۔

کچھ عرصہ سے محمد عطاء اللہ حنیف لائبریری کی فہرست عربی کتب مکمل کرنے کے بعد اردو کتب شروع کی گئی لیکن کچھ عرصہ سے تعطل آ گیا تھا البتہ اب اس کو بھی ان شاءاللہ دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

قارئین کرام! یہ تھے ہمارے احوال، فیصلے اور ارادے جن کے بارے یہی معروف جملہ مناسب رہے گا کہ **السعی منا و الاتمام من الله**

فی جوارِ رحمت اللہ

حافظ احمد شاکر

گزشتہ ہفتہ ایک بہت بڑا ذاتی ...... زیادہ ...... جماعتی اور علمی حادثہ ہوا کہ ہمارے خوش جمال، خوش خصال اور خوش خیال دوست محترم پروفیسر عبدالجبار شاکر دل کی جراحی کے دوران انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میانہ قد، کشادہ پیشانی، سدا کا ہنستا مسکراتا چہرہ، متحرک پلکیں، شرم وحیاء سے جھکی ہوئی خوب صورت غزالی آنکھیں، موتیوں جیسے چمکتے دانت، باوقار چال، تمکنت آمیز گفتگو، کچھ کرنے کے لیے بے تاب اور علم کے لیے ماہی بے آب۔ بڑوں کے لیے مؤدب، چھوٹوں کے لیے شفقت، یہ ان کا سراپا تھا۔ ؎ فقط اک ترے نہ ہونے سے اے دوست گلوں میں رنگ وبو کہاں چاند میں چاندنی کہاں

شاکر صاحب ۱۹۴۷ء میں میر محمد ضلع ......اس وقت لاہور اب...... قصور میں حکیم عبدالعزیز رحمہ اللہ کے گھر پیدا ہوئے۔ والد نے ان کا نام تفاؤلاً امام عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کے نام پر عبدالجبار رکھا۔ ان سے چھوٹے صرف ایک ہی بھائی عبدالقیوم ہیں جو پتوکی میں کاروبار کرتے ہیں اور ایک ہی ہمشیرہ۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم شام کوٹ، حسین خانوالہ میں حاصل کی پھر گریجوایشن ......اس وقت کے منٹگمری اور اب...... ساہیوال سے کر کے ایم اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا اور پھر کچھ عرصہ میونسپل کالج میں پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد ان کی صادق آباد میں پوسٹنگ ہوگئی۔

شاکر صاحب رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی حوصلہ، ضبط، خود اعتمادی، قوت ارادی اور قوت فیصلہ کی نعمت سے سرفراز کیا ہوا تھا۔ چودہ سال قبل ان کا پہلا بائی پاس ہوا تھا، پھر اس کے بعد ان کی ایک جانب فالج کا شدید حملہ بھی ہوا۔ لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پر ان کے مؤمنانہ توکل نے ان کو غیر معمولی قوت ارادی سے بہرہ ور کر رکھا تھا۔ اس لیے معالجوں کے جھرمٹ سے نکلتے اور بستر علالت کو چھوڑتے ہی انہوں نے تمام معمولات شروع کر دیئے تھے۔ بائی پاس کے کچھ ہی دن بعد وہ المکتبۃ السلفیۃ تشریف لائے اور حسب معمول خوش وخرم، چاق وچوبند اور مطمئن تھے۔ ایسے ہی فالج کے بعد بھی بہت جلد وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے لگے۔ اب سے تقریباً تین ماہ قبل ان کو ایک ایسے غیر معمولی آپریشن سے گزرنا پڑا جس کا دورانیہ صرف ۱۳ یا ۱۴ سیکنڈ کا ہوتا ہے۔ اس سے قبل پاکستان میں وہ آپریشن صرف بارہ افراد کے ہوئے تھے جن میں زندگی صرف تین کو ملی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کا وہ آپریشن بھی کامیاب ہوگیا۔ آپریشن کے بعد ان کی بیمار پرسی کے لیے دعوہ اکیڈمی میں ملاقات ہوئی تو وہی اطمینان سدا کا ہنستا مسکراتا چہرہ اور بارگاہِ ربّ قدیر میں ان کو سراپا تشکر پایا۔ آہ ؎

ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو ان کے لہجہ میں ادب کے تیور

اب بائی پاس کا ان کا یہ دوسرا آپریشن تھا جو پہلے آپریشن سے زیادہ نازک نہ تھا۔ آپریشن کے لیے ہسپتال آنے کے دن رات ڈیڑھ بجے تک مختلف کتابوں کے مقدمات وغیرہ لکھتے رہے پھر تہجد پڑھی اور معمولات ادا کیے اور ہسپتال آ گئے۔ اس آپریشن کے بارے میں وہ بھی فکر مند نہیں تھے اور ان کے معالجین بھی پر امید تھے لیکن دوران آپریشن ہی وہ خالق حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ویراں ہے میکدہ، خم وساغر اداس ہیں تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

ان کا مطالعہ کثیر الجہات تھا۔قرآن،حدیث،سیرت،ادب،اقبالیات اوراس کے علاوہ مشہور شعراء کا کلام ان کی نظر میں تھا۔مختلف موضوعات پران کا خطاب اپنے موضوع کا مکمل احاطہ کیے ہوئے ہوتا تھا۔ہمارے علم کی حد تک وہ اردو زبان کی کامیاب خطابت کے علاوہ عربی اردو اور فارسی میں بھی اظہار خیال کی قدرت رکھتے تھے۔وہ ایک بہترین اور موضوع کا حق ادا کرنے والے مقرر تھے،جو ان کو ایک بار سنتا دوبارہ سننے کا شوق فراواں لے کر جاتا۔چناں چہ ملک و بیرون ملک سو سے زائد مرتبہ انہوں نے سیرت النبی پر خطاب کی سعادت حاصل کی اور ایسے ہی سو سے زائد مقامات پر اقبالیات کے موضوع پر مقالے پڑھ کر اپنی اقبال شناسی متعارف کروائی۔

کچھ عرصہ قبل دعوہ اکیڈمی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے وہ اسلام آباد تشریف لے گئے تھے۔اب حکومت اسلام آباد میں ایک قومی سیرت لائبریری قائم کرنا چاہتی تھی جس کے لیے حکومت کی نظر انتخاب ان پر تھی کہ وہ سیرت چیئر کے چیئرمین تو تھے ہی لیکن ع آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

ان کا تعلق اصل کتاب سے تھا اور کتابوں پر ان کی نظر بھی خوب تھی۔ایک طویل عرصہ وہ پنجاب کی پبلک لائبریریز کے ڈائریکٹر رہے۔آج کل پنجاب حکومت کے قائم کردہ قرآن بورڈ کے ممبر بھی تھے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ کتابوں کی عالمی نمائشوں میں شرکت کرنے کے ساتھ وہاں سے کتابیں خرید کر لاتے جس سے وہ اس لائبریری کو مزین کرتے رہتے۔

ان کی یادگار یا ان کا کارنامہ بیت الحکمت کے نام سے موسوم وہ لائبریری ہے جو بلاشبہ منفرد ہے کہ

⊙...... یہ لائبریری کتب احادیث کے وسیع ذخیرہ کے علاوہ سیرت النبی کے موضوع پر ۱۸ زبانوں میں چار ہزار سے زائد کتب سے منور ہے، اس تعداد میں کتب سیرت کا کسی ایک مقام پر یہ ذخیرہ منفرد ہے۔

⊙......اسی طرح اقبالیات پر یہ لائبریری ۴۰ زبانوں میں چار ہزار پانچ صد کتابوں سے مزین ہے۔

⊙......اس لائبریری میں ایک لاکھ کے قریب مطبوعہ کتب موجود ہیں۔

⊙......۱۹۸۶ء میں صدر ضیاء الحق مرحوم نے کتب سیرت کے گراں قدر ذخیرے کی بنا پر ان کو خاص ایوارڈ بھی دیا تھا۔

⊙......ایسے ہی حکومت ایران نے ایران میں منعقدہ مخطوطات کی عالمی نمائش پر ان کو تیسرا انعام دیا تھا۔

⊙......۲۰۰۵ء میں فیصل مسجد کے احاطہ میں خطی قرآنِ مجید کی نمائش میں بھی انہوں نے حصہ لیا تھا جس کا افتتاح صدر پرویز مشرف نے کیا تھا۔

اس لائبریری کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے طلباء نے صرف اس لائبریری کے فہرست پر سات مقالہ جات لکھے ہیں۔

ان کے صاحبزادگان! صلاح الدین ایوبی (لیکچرار)،جمال الدین افغانی،رفیع الدین حجازی (تاجرانِ کتب)،کبیر الدین رازی (سرکاری ملازم)،جلال الدین رومی،نجم الدین فارانی (طالب علم)،اس لائبریری کو علم کا چشمہ فیض اور نشر کتب ان کے لیے صدقہ جاریہ بنانے کے جذبات خیر رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے۔

ادارہ الاعتصام ان کے پسماندگان بھائی،بہن،بیوہ،بیٹوں اور بیٹیوں سے اظہار تعزیت کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کی بشری لغزشوں کو معاف فرما کر ان کی حسنات قبول فرما کر ان کی بلندئ درجات کا سبب بنائے۔ آمین!



پروفیسر عبدالجبار شاکر مرحوم کی یاد میں

محمد عزیر شمس (مکہ مکرمہ)

ابھی ابھی عزیزم حماد شاکر (بن حافظ احمد شاکر) نے فون پہ یہ اندوہناک خبر سنائی کہ پروفیسر عبدالجبار شاکر آج انتقال کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم بڑے علم دوست، کتاب شناس، مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک تھے، مجھے ان کے حالات زندگی کا پتا نہیں، پہلی بار ملاقات ۱۹۸۷ء میں ہوئی جب وہ پنجاب پبلک لائبریریز کے ڈائریکٹر ہوا کرتے تھے۔ لاہور سے میں ان کے ساتھ شیخوپورہ گیا، وہاں ان کا مکان اسٹیڈیم کے قریب تھا۔ ان کے گھر میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آئیں۔ مجھے چوں کہ عربی مخطوطات سے دلچسپی ہے، اس لیے میں نے ان سے ان کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ چناں چہ انھوں نے ایک مجموعہ میرے سامنے رکھ دیا۔ میں دیر تک ان مخطوطات کا مطالعہ کرتا رہا۔ انھوں نے کہا کہ اگر زحمت نہ ہو تو ساتھ ہی ساتھ ان کی ایک مختصر فہرست تیار کر دوں۔ میں نے خوشی سے یہ کام کیا۔ عربی مخطوطات کی تعداد اُس وقت ان کے پاس غالباً ۶۰، ۷۰ رہی ہوگی۔ اردو اور فارسی مخطوطات کی تعداد زیادہ تھی۔ قرآنِ مجید کے قلمی نسخے بھی بڑی تعداد میں تھے۔ عربی مخطوطات میں مجھے بعض نادر کتابیں نظر آئیں۔ چند ہندوستانی شعراء کے عربی قصائد، فقہ واصول کی بعض اہم کتابیں، امام ذہبی کا ایک رسالہ ''زغل العلم''، تفسیر کواشی (جو تفسیر جلالین کی اصل ہے) وغیرہ ان میں قابل ذکر ہیں۔ چند مخطوطات کی مجھے ضرورت تھی، انھوں نے ان کی فوٹو کاپی مجھے عنایت کی۔ اُس وقت ان کے ذخیرۂ کتب میں اقبالیات کا بہت بڑا مجموعہ تھا۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں شاعرِ مشرق پر جو کام ہوا ہے، ان کے مجموعہ ہائے کلام اور تصانیف کے اوّلین ایڈیشن، اور ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نادر تحریریں ان کے پاس موجود تھیں۔ انھوں نے علامہ اقبال سے متعلق اس وقت تک کی تمام مطبوعات پر مشتمل ایک ببلیوگرافی شائع کی تھی جس کا ایک نسخہ انھوں نے مجھے بھی عطا کیا۔

مخطوطات، قرآنِ مجید کے قلمی نسخوں اور اقبالیات کے علاوہ ان کی دلچسپی کے اور بھی کئی میدان تھے۔ مثلاً سفرنامے، تذکرے، لغات، خطاطی کے نمونے اور ان پر مشتمل کتابیں، شعراء کے دواوین، مخطوطات اور مطبوعات کی فہرستیں وغیرہ۔ مگر سب سے زیادہ جس موضوع سے انھیں دلچسپی تھی وہ سیرت نبوی ہے۔ اس فن پر دنیا کی ۴۴ سے زیادہ زبانوں میں ان کے پاس قدیم وجدید مطبوعات کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ شاید ہی دنیا کی کسی ایک لائبریری میں جمع ہو۔ آخری ۲۰، ۲۲ سال (جب سے میں انھیں جانتا ہوں) وہ سیرت کی کتابیں جمع کرتے رہے۔ اس دوران جب بھی وہ حج یا عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ آتے میں انھیں لے کر مختلف مکتبات میں گھومتا رہتا۔ وہ سیرت کی ساری موجود کتابیں خرید لیتے، خواہ وہ کسی قیمت پر دستیاب ہوں۔

ایک عرصہ تک وہ ہر سال بذاتِ خود اور حاجیوں کے ذریعہ پھر کارگو سے کتابوں کے کارٹون پاکستان لے جاتے رہے۔ عربی میں سیرت کی کتابوں کی ایک فہرست انھوں نے حروف تہجی کے اعتبار سے تیار کر رکھی تھی، مکتبات میں ان کے علاوہ دیگر نئی کتابوں کی تلاش میں رہتے، اور ہر سال فہرست میں ان کا اضافہ ہوتا رہتا۔

سیرت پر کتابوں کے علاوہ اس فن پر مطبوعہ یا قلمی کتابوں کی جو ببلیوگرافیاں اب تک شائع ہوئی ہیں وہ بھی انھوں نے جمع کی تھیں، اور اپنے بعض مضامین میں ان کا تعارف بھی کرایا تھا۔ اس فن پر عربی کی ایک مشہور کتاب ''معجم ما الف عن رسول الله'' (صلاح الدین منجد) تقریباً

چالیس سال قبل بیروت سے شائع ہوئی تھی، جواب نایاب ہے۔ مرحوم کو اس کی بڑی تلاش تھی۔ حسن اتفاق سے میرے فاضل دوست محمد السلیمانی صاحب کے پاس اس کے دو نسخے تھے، ان سے ملنے ان کے گھر گئے تو انھوں نے ایک نسخہ شاکر صاحب کو ہدیۃً دے دیا۔ اسے پا کر وہ بہت خوش ہوئے۔

مکہ مکرمہ جب بھی آتے یہاں کے علمی مراکز (خصوصاً جامعہ ام القریٰ، رابطۃ العالم الاسلامی، مکتبۃ الحرم المکی) کی زیارت کرتے، اہل علم سے ملاقات کرتے، نئی مطبوعات اور تحقیقات کے بارے میں دریافت کرتے، اپنے ذخیرۂ کتب کا تعارف کراتے، نوادرات کی تلاش وجستجو میں رہتے، علماء وفضلاء سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے۔ مکہ اور جدہ میں وہ دعوتی اور علمی وادبی پروگراموں میں بھی شریک ہوئے، اور حاضرین کو خطاب کرتے۔ ان سے ہر حلقہ اور فکر ومسلک کے لوگ ملتے اور خوش ہوتے تھے۔ مکہ میں وہ شیخ ابوالاشبال صغیر احمد شاغف، ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی اور ڈاکٹر وصی اللہ محمد عباس سے خاص طور پر ملتے۔ میرے گھر بھی تشریف لاتے، اور خدمت کا موقع دیتے۔ وہ میرے ذخیرۂ کتب کو دیکھ کر کہتے کہ مذہب اور تاریخ کے علاوہ عربی ادب ولسانیات کی منتخب کتابیں تم نے خوب جمع کی ہیں۔ علماء اور عربی مدارس کی لائبریریوں میں یہ چیزیں نظر نہیں آتیں۔

میں ایک عرصے سے امام ابن تیمیہ کی غیر مطبوعہ تصانیف کی تلاش وجستجو اور ان کی تحقیق واشاعت میں مصروف ہوں۔ اب تک ان کی ۱۰ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، امام صاحب سے متعلق ایک مفصل ببلیوگرافی بھی عربی میں ترتیب دے رہا ہوں جس میں ان کی شخصیت اور تصانیف سے متعلق کسی بھی زبان میں جو بھی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد موجود ہے اس کا تذکرہ اور اس پر تبصرہ ہوگا۔

مرحوم کو میرے اس کام سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں جلد از جلد اس کی تکمیل کرلوں۔ پھر امام صاحب اور ان کے افکار پر اردو میں بھی ایک مفصل کتاب لکھوں۔ افسوس کہ ان کی زندگی میں اس خواہش کی تکمیل نہ کر سکا۔ اب تک امام صاحب کی جو تصانیف میں نے پہلی بار شائع کی ہیں ان کا ایک سیٹ مرحوم کی خدمت میں پیش کیا تھا جسے دیکھ کر وہ خوش ہوئے۔

مکہ مکرمہ میں ایک قاضی رفاعی ہیں جن کے پاس اس شہر میں سب سے بڑی ذاتی لائبریری ہے۔ اپنے گھر پر وہ علماء وفضلاء کو جمع کرتے اور علمی نشستیں منعقد کرتے رہتے ہیں۔ ایک بار انھیں مرحوم کی آمد کا پتا چلا تو انھیں دعوت دی اور ایک علمی مجلس کا اہتمام کیا۔ مرحوم نے وہاں ایک لیکچر دیا جس میں انھوں نے حدیث اور سیرت کے تعلق سے برصغیر کے فضلاء کی خدمات کا بڑی خوبی سے تذکرہ کیا۔ اپنے ذاتی ذخیرۂ کتب کے نوادرات کا ذکر کیا اور بتایا کہ میرے پیش نظر اب سیرت نبوی سے متعلق ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کا منصوبہ ہے۔ مجوزہ عناوین کا انتخاب اور ضروری مواد کی فراہمی کا کام ہو چکا ہے۔ اب اللہ نے توفیق دی تو اسی کے لیے جٹ جاؤں گا۔ میں نے اس مجلس میں مرحوم کے لیکچر کا عربی ترجمہ کیا۔ پھر سوال وجواب کا سلسلہ جاری رہا۔ اخیر میں عربوں کی روایت کے مطابق بڑی پُرتکلف دعوت کا انتظام تھا۔

میں ان کے ساتھ گھنٹوں مختلف علمی موضوعات اور کتابوں سے متعلق گفتگو کرتا رہتا، نئی کتابوں کی خبر دیتا، مخطوطات اور قدیم مطبوعات کی از سرنو اشاعت پر توجہ دلاتا۔ پاکستان میں مطبوعہ کتابوں کے بارے میں دریافت کرتا۔ مرحوم کہا کرتے کہ میں نے اپنے لڑکے جمال الدین افغانی کو کتابوں کی طباعت واشاعت میں لگا دیا ہے اور پوری زندگی میں نے جو ذخیرہ جمع کیا ہے اسے ''بیت الحکمت'' میں محفوظ کر دیا ہے، امید ہے کہ اس سے اہل علم اور محققین استفادہ کرتے رہیں گے۔ اس کی مکمل فہرست تیار کرنے کے لیے انھوں نے کئی ریسرچ اسکالرز اور فضلاء کو لگا رکھا تھا۔ امید ہے کہ بڑی حد تک یہ کام ہو چکا ہوگا۔

افسوس میں اب تک ''بیت الحکمت'' کی زیارت سے محروم ہوں۔ اب تو اس میں عربی مخطوطات کی بھی بڑی تعداد جمع ہو چکی ہے، ان کی بعض فہرستیں انھوں نے مجھے دکھائی تھیں، مطبوعہ ہزاروں کتابوں کی فہرست سازی کا کام جاری تھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مرکز کو قائم ودائم رکھے، اور اسے مرحوم کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ اس مرکز کی تعمیر میں انھوں نے ذاتی دلچسپی سے بعض ان امور کا لحاظ رکھا تھا جو قدیم طرز تعمیر اور اسلامی تہذیب کا

نمونہ ہیں، اس کے دروازوں، الماریوں، اور کتابوں کی جلدوں اور دوسری بہت سی چیزوں میں یہ اثرات نمایاں ہیں۔ مرحوم نے ان کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا، جو مجھے یاد نہیں۔ اور دراصل ان کا تعلق مشاہرہ اور ذوقِ جمال سے ہے، اور بذاتِ خود ''بیت الحکمت'' کی زیارت کے بغیر ان پر تبصرہ ممکن نہیں۔ میری اور میرے دوست سلیمانی صاحب کی خواہش تھی کہ عالمی سطح پر اس مرکز کے تعارف کے لیے اس سے متعلق ایک پروگرام کم از کم الجزیرہ ٹی وی چینل کے ذریعہ شائع کیا جاتا تاکہ لوگ اس کی اہمیت سے واقف ہوسکیں۔ اس کے لیے سلیمانی صاحب نے ''الجزیرہ'' کے بعض کارکنوں سے گفتگو بھی کی تھی، مگر افسوس کہ مرحوم کی زندگی میں اس کا اہتمام نہ ہوسکا، ان شاءاللہ آئندہ اس کا تدارک کیا جائے گا۔

مرحوم مجھ سے کہا کرتے تھے کہ انھیں ٹی وی کے پروگراموں سے کوئی رغبت نہیں، ان کا اوڑھنا بچھونا کتاب ہے۔ اور متنبّی کے بقول کتاب بہترین ساتھی ہے۔ اس لیے ان کا اکثر وقت کتابوں میں گزرتا تھا۔ ہمیشہ نادر اور اہم کتابوں کی تلاش میں لگے رہتے، اور برابر انھیں اپنے مطالعہ میں رکھتے۔ ایک بار مجھ سے کہا کہ اس مرتبہ ''اغانی'' (ابوالفرج اصبہانی) کا ایک نسخہ لینا ہے، کتاب چوں کہ عربی شاعری، ادب، تاریخ اور تہذیب وثقافت پر مشتمل موسوعاتی انداز کی ہے، اس کی ترتیب بھی موضوعات وابواب پر نہیں، معلومات بھی عموماً غیر مستند اور مشکوک ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ اس کا مطالعہ کریں گے؟ فرمایا ناول اور افسانہ کی طرح اسے بھی آرام کے اوقات میں دیکھا کروں گا۔ سنجیدگی اور توجہ سے مطالعہ کی چیز تو ہے نہیں۔ پھر انھوں نے احسان عباس کا ایڈٹ کیا ہوا مطبوعہ نسخہ خریدا جو ۲۷ جلدوں پر مشتمل ہے۔

انھوں نے مختلف موضوعات پر ملک اور بیرونِ ملک میں لیکچرز دیے جن میں سے کچھ ریکارڈ کیے گئے اور علمی حلقوں میں ان کی پذیرائی ہوئی۔ کئی بار رمضان اور حج میں مکہ مکرمہ آئے یہاں ان کے پروگرام مختلف جگہ ہوتے۔ وہ لوگوں کے سامنے حج کے احکام ومسائل اور اس کے اغراض ومقاصد بیان کرتے، اور سوالوں کے جواب دیتے۔ جدہ اور دوسرے شہروں میں علمی اور ادبی مجلسیں منعقد ہوتیں جہاں مختلف موضوعات پر خطاب فرماتے۔ یہ بیانات اتنے پرمغز مدلل، مربوط اور فصیح وبلیغ ہوتے کہ انھیں بغیر کاٹ چھانٹ کے ہو بہو شائع کیا جاسکتا۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ بڑے سے بڑے ادیب بولتے یا خطاب کرتے وقت اعلیٰ ادبی اسلوب کی رعایت نہیں کرپاتے، جب کہ لکھتے وقت یا شاعری کے لیے اس کی پابندی ضروری سمجھتے ہیں۔ مرحوم کی عام گفتگو ہو یا عوامی تقریر، ادبی مجلس میں خطاب ہو یا بین الاقوامی کانفرنسوں میں لیکچر ہمیشہ فصیح وبلیغ زبان استعمال کرتے۔

مجھے کئی بار ان کے لیکچرز اور تقریریوں کے پروگراموں میں شرکت کا موقع ملا اور ہمیشہ اس کا مشاہدہ کیا۔ پانچ سال قبل جب وہ ہندوستان گئے، میں اس وقت حیدرآباد میں تھا، مجھے پتا چلا تو فوراً ان سے ملنے دلّی گیا۔ اور وہاں ان کے ساتھ کئی علمی وادبی مجلسوں میں شریک ہوا، ایوانِ غالب میں ان کے اور مشہور شاعر احمد فراز کے اعزاز میں ایک جلسہ مشاعرہ کا اہتمام ہوا۔ اس وقت انھیں بہ حیثیت شاعر بھی دیکھا اور سنا۔ دلّی کے پرگتی میدان میں ان دنوں کتابوں کی بین الاقوامی نمائش لگی ہوئی تھی۔ ہم دونوں اس میں گھنٹوں ساتھ گھومتے رہے اور کتابیں خریدتے رہے۔ ایک بار پاکستانی کتابوں کے اسٹال کے پاس ایک جگہ بیٹھ گئے، کچھ ٹی وی چینل والے وہاں آگئے اور موصوف سے کتابوں اور ان کی موجودہ نمائش کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرنے کی درخواست کی، اور کہا کہ صرف تین منٹ میں جو کچھ کہنا ہو کہیں۔ مرحوم نے ٹھیک تین منٹ میں مختصر طور پر کتابوں کی اہمیت اور اس نمائش کی افادیت کے بارے میں اپنے تاثرات بڑے فصیح اور جامع انداز میں بیان کردیے۔ اور ٹی وی والوں سے کہا کہ ان شاءاللہ آپ کو اسے ایڈٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

خطابات اور لیکچرز کے علاوہ وہ تحریر کے میدان میں بھی مشہور تھے۔ ان کے بے شمار مقالات مختلف رسائل ومجلّات میں شائع ہوئے ہیں۔ جب میں ان سے ان کی کتابوں کے بارے میں پوچھتا تو وہ کہتے کہ میں کتابوں کا مصنف تو نہیں البتہ سو سے زیادہ کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں۔ میں ان

سے ان کے جمع کرنے کی درخواست کرتا تو ٹال جاتے۔

کئی کتابوں پر میں نے ان کے مقدمے دیکھے ہیں جو کافی طویل اور معلوماتی ہیں۔خصوصاً وہ مقدمے جو انھوں نے ''تذکرۃ النبلاء'' (عبدالرشید عراقی)،''پردہ جو اٹھا دوا گر چہرۂ الفاظ سے'' (ف۔عبدالرحیم)،''سیرۃ البخاری'' (عبدالسلام مبارک پوری) اور''مقالاتِ شاغف'' (ابوالاشبال صغیر احمد شاغف) پر لکھے ہیں۔آخری کتاب کی اشاعت کے وقت اس پر مکمل نظر ثانی بھی کی ہے جس سے کتاب زیادہ وقیع ہوگئی ہے۔

''سیرۃ البخاری'' کی طباعت واشاعت کا منصوبہ انھوں نے کئی سال قبل بنایا تھا۔اس کی کمپوزنگ بھی انھوں نے کرا رکھی تھی۔میں نے انھیں بتایا کہ اس کا عربی ترجمہ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی نے کیا ہے،اور اس پر بڑے ہی قیمتی اور علمی حواشی تحریر کیے ہیں۔عربی میں یہ کتاب دو جلدوں میں مکہ مکرمہ سے شائع ہوئی ہے۔انھوں نے ایک سفر میں اسے خریدا اور ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی صاحب سے رابطۃ العالم الاسلامی جا کر ملاقات کی،اور حواشی کے اردو ترجمے کی اجازت لی۔پھر بعض فضلاء کو ان کے ترجمے پر لگا دیا،چند ماہ قبل کتاب شائع ہوئی،جو سابقہ تمام ایڈیشن سے بہتر ہے۔مرحوم نے اس پر بہت مفصل مقدمہ لکھا ہے جو قابل مطالعہ ہے۔

''رحمۃ للعالمین'' (قاضی سلیمان منصور پوری) کے نئے ایڈیشن کے لیے بھی وہ ایک مفصل مقدمہ لکھ رہے تھے۔اس کے بعض اجزاء انھوں نے مجھے دکھائے تھے۔اس میں سیرت کی متعدد قدیم وجدید کتابوں کا تجزیہ تھا۔مجھے علم نہیں کہ یہ مقدمہ کتاب کے کسی ایڈیشن کے ساتھ شائع ہوا یا نہیں۔

انھوں نے مجھے علامہ اقبال کے تمام شعری ونثری سرمایہ کی بہ حیثیت کلیات اشاعت کے بارے میں بھی بتایا تھا،اس کے لیے ان کے پاس سارا مواد جمع تھا،ان کی خواہش تھی کہ یہ مجموعہ بھی جلد ترتیب پا کر شائع ہو جائے،جو بہت سی نادر ونایاب تحریروں،تقریروں،نظموں اور خطوط پر مشتمل ہوگا۔

آخری زندگی میں انھوں نے سیرت انسائیکلو پیڈیا کا منصوبہ اور اس کے موضوعات کا تفصیلی خاکہ تیار کر رکھا تھا،اس کے لیے وہ ایک کانفرنس بھی کرنا چاہتے تھے اور اہل علم کی ایک ٹیم کے ساتھ وہ اس کی تکمیل کے خواہاں تھے۔مجھ سے کہتے تھے کہ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اس کے لیے پورے طور پر فارغ ہو جائیں گے۔مگر ریٹائرمنٹ کے بعد مزید توسیع ہوگئی اور اخیر میں دعوۃ اکیڈمی کے نائب مدیر سے مدیر بن گئے۔جس کی وجہ سے ان کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں اور وہ اکیڈمی کے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ملازمت میں توسیع کی خبر انھیں مکہ مکرمہ میں ملی،مجھ سے انھوں نے اس کا ذکر حرم شریف میں کیا اور کہا کہ میں سوچتا تھا کہ ملازمت کے بندھن سے نجات مل جائے گی تو سیرت پر کام کرنے کے لیے پورے طور پر یک سو ہو جاؤں گا۔اب دیکھئے کب تک اس سے وابستہ رہنا پڑتا ہے۔

مرحوم کے اخلاف سے میری گزارش ہے کہ وہ ان کی ساری تقریریں اور تحریریں جمع کریں۔تقریروں کے کیسٹ اور سی ڈی تیار کریں تاکہ شائقین ان سے استفادہ کر سکیں۔ان کے مقدمے اور مقالات بھی سب ایک الماری میں محفوظ کر دیں،پھر ان کا مجموعہ کتابی شکل میں شائع کریں۔غیر مطبوعہ تحریریں،خاکے،تجاویز اور خطوط وغیرہ بھی جتنے دستیاب ہو سکیں اکٹھا کریں۔''کلیات اقبال'' ان کے منصوبے کے مطابق شائع کریں۔اس کا سارا مواد ان کی لائبریری میں موجود ہے۔باقی رہا سیرت انسائیکلو پیڈیا کا منصوبہ،تو اس کے لیے اہل علم سے مشورہ کے بعد ماہرین کی ایک کمیٹی بنائیں،اور مرحوم کے نہج پر اس منصوبے کی تکمیل کے لیے کام کریں۔سارے مآخذ ومراجع مختلف زبانوں میں سیرت نبوی سے متعلق ''بیت الحکمت'' میں جمع ہیں۔اور غالباً سیرت پر دنیا میں سب سے بڑا ذخیرہ یہاں موجود ہے۔اس لیے صرف کام کرنے والے افراد اور ان کی ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔

مرحوم علمی کاموں میں ہر طرح میری مدد کرتے تھے۔امام ابن تیمیہ کے علاوہ میں نے شاہ ولی اللہ کی ساری تصانیف کے مطبوعہ وقلمی نسخے جمع کر کے انھیں از سر نو ایڈٹ کرنے کا منصوبہ کئی سال قبل بنایا تھا۔اب تک ان کی عربی کتابوں کی تحقیق کا کام کر چکا ہوں۔امید ہے کہ جلد ہی ان کی اشاعت عمل میں آئے گی۔اس سلسلے میں جن اہل علم نے میری معاونت کی ان میں مرحوم پروفیسر عبدالجبار شاکر،حافظ احمد شاکر،اور جناب رؤف احمد

صاحب قابل ذکر ہیں۔ان کے ذریعہ بعض بڑی اہم اور نادر کتب ورسائل کا حصول میرے لیے ممکن ہوا۔مرحوم سے ایک بار میں نے ذکر کیا کہ برصغیر کے جدید فکری رجحانات، معاصر تحریکات اور مؤثر شخصیات پر عربی میں کوئی جامع کتاب نہیں، جن لوگوں نے عربی میں کچھ لکھا ہے انھوں نے کسی مخصوص جماعت، شخصیت یا مکتب فکر کی تعریف وتوصیف کی ہے، اور مخالفین کو یا تو نظر انداز کردیا ہے یا نامناسب الفاظ میں انھیں یاد کیا ہے، اور انصاف سے کام نہیں لیا۔ میں نے سید احمد خاں سے لے کر اب تک کی مشہور شخصیات اور رجحانات وتحریکات کا ایک خاکہ بنایا، اور ان کے فکر ومسلک اور خدمات واثرات کا جائزہ لینے کے لیے ان کی اور ان کے مخالفین کی تحریروں، اور معاصر رسائل وجرائد کو اصل ماخذ قرار دیا۔ مرحوم میرے اس منصوبے سے متفق تھے۔انھوں نے مختلف شخصیات پر شائع شدہ متعدد کتابیں مجھے بھجوائیں، اور کہا کہ جو کتابیں دستیاب نہیں، ان کی فوٹو کاپی بہ آسانی حاصل ہوسکتی ہے۔

میرے خیال میں ایسی ایک کتاب کی ضرورت اردو میں بھی ہے۔ انگریزی میں عزیز احمد نے اپنی کتاب Islamic Modernism in India and Pakistan (برصغیر میں اسلامی جدیدیت) میں ایک مخصوص نقطہ نظر سے ان شخصیات اور تحریکات کا جائزہ لیا ہے۔ مگر اس کی اشاعت پر چالیس سال گزر گئے ہیں، اس دوران کئی رجحانات اور شخصیات سامنے آئیں جن کا مطالعہ ضروری ہے۔

مرحوم مسلکاً اہل حدیث تھے، جماعت اسلامی سے بھی تعلق تھا۔ اس تعلق کی تفصیلات کا مجھے علم نہیں۔ میں نے جماعت والوں کو عموماً ان کا بڑا احترام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ سعودی عرب میں ان کے ساتھ مختلف پروگراموں میں شرکت کرتے تھے، مگر ساتھ ہی یہاں کے اہل حدیث علماء سے بھی برابر ملاقات کرتے، اور ان سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ شخصیات اور کتابوں پر مناسب تبصرہ کرتے، میں نے کبھی انھیں کسی کی تحقیر وتذلیل کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ تمام مکاتب فکر کے اہل علم کا ذکر خیر کرتے۔ سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال، مولانا آزاد، مولانا مودودی، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا محمد اسماعیل سلفی اور ماضی قریب کے دیگر اہل علم کا تذکرہ ہوتا تو ان کی خدمات کی تحسین کرتے۔ اور طلبا کو ان کی تصانیف وتحقیقات سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیتے۔ مولانا حنیف ندوی کے بارے میں فرماتے کہ ان کے اندر تین خصوصیتیں جمع تھیں: عقیدہ میں سلفیت، اسلوب نگارش میں ندویت اور بحث وتحقیق میں فلسفیانہ انداز۔

علامہ اقبال کی شاعری، مولانا آزاد کے الہلال اور ترجمان القرآن، مولانا مودودی کے اسلوبِ دعوت، مولانا بھوجیانی کی علمی تحقیقات اور مولانا اسماعیل سلفی کے طریقۂ دفاع حدیث واہل حدیث کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے اور فرماتے کہ تعصب اور تنگ نظری چھوڑ کر ہمیں اپنے اندر وسعت قلب اور آزادئ فکر ونظر پیدا کرنا چاہیے۔ برصغیر کے سیرت نگاروں میں وہ علامہ شبلی وسید سلیمان ندوی کی ''سیرت النبی''، قاضی سلیمان منصور پوری کی ''رحمۃ للعالمین''، مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری کی ''اصح السیر''، مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کی ''الرحیق المختوم''، سید سلیمان ندوی کی ''خطبات مدارس'' کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ مولانا کرامت علی اسرائیلی دہلوی کی ضخیم عربی کتاب ''السیرۃ المحمدیۃ'' کے بارے میں ان کی خواہش تھی کہ اس کی از سرنو طباعت عمل میں آئے۔ اس کا ایک نسخہ ان کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔ میں انھیں سیرت کی غیر مطبوعہ عربی کتابوں کے بارے میں بتاتا اور ان کی اشاعت کی طرف توجہ دلاتا، وہ کہتے کہ ان شاء اللہ موقع ملا تو ان کی طباعت واشاعت کا بھی اہتمام کیا جائے گا۔

وہ چاہتے تھے کہ ڈاکٹر حمید اللہ کی اردو کتابوں (خصوصاً ''خطباتِ بہاول پور'') کا عربی ترجمہ شائع ہو۔ مگر پاکستان میں عربی میں لکھنے، ترجمہ کرنے اور تحقیقی کام کے لیے باصلاحیت افراد کی قلت کا ذکر کرتے اور کہتے کہ ہندوستان میں ندوہ، دیوبند، جامعہ سلفیہ، علی گڑھ، دائرۃ المعارف العثمانیہ حتیٰ کہ حکومت کے مختلف اداروں سے بھی بلند پایہ علمی مجلّات اور تحقیقی کتابیں عربی میں برابر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ پاکستان میں ادارہ تحقیقات

اسلامی، اسلام آباد) کا ایک عربی مجلّہ ''الدراسات الاسلامیہ'' قابل ذکر ہے اور بس۔ یہاں عربی کی طرف زیادہ توجہ نہیں، عربی مخطوطات سے دلچسپی تقریباً مفقود ہے۔ عربی زبان کی تعلیم کا اہتمام بھی مدارس وجامعات میں بہت کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامیات پر عربی کے بجائے اردو اور انگریزی میں لکھنے پڑھنے والے بہت ہیں، کچھ لوگوں نے عربی کی ترویج واشاعت کی بڑی کوشش کی، اس کے لیے نصابی کتابیں تیار کیں، مدارس اور معاہد کھولے، مگر یہ ساری تدبیریں صورتِ حال کی اصلاح نہ کرسکیں۔

مرحوم ان امور کا بڑی حسرت کے ساتھ ذکر کرتے، تعلیمی اداروں میں علمی انحطاط، طلبا کے اندر پست ہمتی، مطالعہ وتحقیق سے بے رغبتی، اپنی زبان اور تہذیب سے ناواقفیت کی شکایت کرتے۔ اور فرماتے کہ جب تک مطالعہ کتب کا شوق، اسلامی میراث کی قدر، عربی زبان وادب سے شغف، قرآن وسنت سے گہری وابستگی اور بحث وتحقیق کا ذوق کسی کے اندر نہ ہو وہ کوئی قابل ذکر علمی کام کرنے کا اہل نہیں ہوسکتا۔ ''بیت الحکمت'' قائم کر کے وہ قارئین کی علمی پیاس بجھانے کے ساتھ ان کی مناسب تربیت کا بھی انتظام کرنا چاہتے تھے۔ سیرت نبوی کی کتابیں جمع کرنے کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ ہر مکتبہ فکر کے اہل علم ودانش ان سے استفادہ کریں، ایک دوسرے کے قریب آئیں، مسلکی اختلافات کی بنا پر ان کے درمیان جو دوری ہے وہ ختم ہو۔ سارے مسلمان سیرت طیبہ کے حقیقی پیغام کو سمجھیں۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات سے عقیدت ومحبت میں غلو (حد سے تجاوز) اور ان کی شخصیت اور سنت کے سلسلے میں جفا (تنقیص اور اعراض) کے جو مظاہر ہمارے معاشرے میں پائے جاتے ہیں ان کی اصلاح ہو۔ اسوۂ حسنہ، رحمۃ للعالمین اور سراجِ منیر کے طور پر ہم انھیں خود پہچانیں اور ساری دنیا کے سامنے اس حیثیت سے ان کا تعارف کرائیں۔ دین کی کوئی تعبیر وتشریح سیرت وسنت کے بغیر معتبر نہیں۔ اور دنیا میں کوئی اصلاح وسدھار تعلیماتِ نبوی کے بغیر ممکن نہیں۔ شاعر مشرق نے کیا خوب کہا ہے:

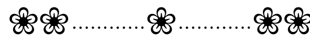
بہ مصطفیٰ بہ رساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

ایک بار میں نے مرحوم سے کہا کہ آپ نے دوسرے علوم وفنون کے مقابلہ میں سیرت پر خصوصی توجہ شاید اس لیے دی ہے کہ اس فن کی ساری کتابیں جمع کرنا نسبتاً آسان ہے۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابیں بے شمار اور عموماً ضخیم اور کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔ سیرت کی اکثر کتابیں ایک دو جلد کی ہیں۔ اس میں ضخیم کتابوں کی تعداد کم ہے۔ پھر ہر زبان میں اس کی مطبوعہ کتابیں محدود ہیں جنھیں جمع کرنا ممکن ہے۔ انھوں نے مسکرا کر فرمایا:

میرے پیش نظر یہ تھا کہ ہر مکتب فکر کے لوگ جس فن سے دلچسپی رکھتے ہوں واس کی تمام کتابیں جمع کرنے کی کوشش کی جائے۔ ظاہر ہے قرآنِ مجید کے بعد مسلمانوں کے لیے سیرت وسنت سے زیادہ اہم اور کچھ نہیں۔ چناں چہ میں نے توکلاً علی اللہ یہ ذخیرہ جمع کرنا شروع کردیا اور اب حال یہ ہے کہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں سیرت پر ہر زبان میں کتابیں دیکھ کر حیرت اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ بڑے بڑے اسکالرز آتے ہیں اور سیرت کی نادر ونایاب کتابیں دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور میرے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔

مرحوم کی بہت سی باتیں، ان کے اخلاق وعادات، علماء کے تذکرے، کتابوں پر تبصرے، کتابیں حاصل کرنے کے قصے اور دیگر بہت سے امور قابل ذکر ہیں۔ سر دست ان ہی سطور پر اکتفا کرتا ہوں۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے، انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے، ''بیت الحکمت'' کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ پس ماندگان کو صبر کی توفیق دے۔ اور ان کا مشن جاری رکھنے کے لیے ہمت دے۔

وما ذلك على الله بعزيز۔



پروفیسر عبدالجبار شاکر

محمد اسحاق بھٹی

کم وبیش تیس برس پہلے کی بات ہے کہ مجھے جڑاں والا (ضلع فیصل آباد) سے میرے بعض عزیزوں نے ٹیلی فون پر بتایا کہ تین روز بعد یہاں فیصل آباد کے ڈپٹی کمشنر کی صدارت میں ایک جلسہ ہو رہا ہے، جس میں دیوبندی، بریلوی، شیعہ اور اہل حدیث حضرات کو سرکاری طور پر اطلاع دی گئی ہے کہ وہ اپنی اپنی جماعت کے ایک ایک مقرر کو دعوت دیں جو اس مجمعے میں مسلمانوں کو اتحاد واتفاق کی تلقین کریں اور اس اختلاف سے دامن بچا کر رکھنے کا درس دیں، جس سے امت میں فساد پھیلنے کا اندیشہ ہو۔ سامعین محدود تعداد میں ہوں گے جن میں ضلع کے حکام بھی شرکت کریں گے۔ عام مقرر سے کام نہیں چلے گا۔ یہاں ایسے مقرر کی ضرورت ہے جو اپنے انداز خطابت سے حاضرین کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس وقت میں ادارہ ثقافت اسلامیہ میں تصنیفی خدمات انجام دیتا تھا۔ ٹیلی فون سن کر سوچ رہا تھا کہ کس مقرر سے رابطہ کیا جائے اور انھیں وہاں جانے کے لیے کیسے آمادہ کیا جائے۔ اتنے میں ایک دوست آئے اور ان سے بات کی تو انھوں نے فوراً کہا، اس کے لیے پروفیسر عبدالجبار شاکر سے رابطہ کرو۔ وہ اس مجمعے کے لیے موزوں مقرر ثابت ہوں گے۔

میں نے یہ نام پہلی دفعہ سنا تھا۔ عرض کیا وہ کہاں رہتے ہیں۔ میں ان سے واقف نہیں۔ ظاہر ہے، وہ بھی مجھے نہیں جانتے ہوں گے۔ انھوں نے ان کا ٹیلی فون نمبر دیا اور میں نے نمبر گھمایا تو آواز آئی۔ ''السلام علیکم'' نہایت میٹھی اور نرم آواز! میں نے اپنا نام بتایا تو بولے۔ میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ نے یاد کیا۔ بہت بہت شکریہ۔

خیر وعافیت کے تبادلے کے بعد عرض مدعا کیا تو کہا: ضرور جاؤں گا۔ بس یہ بتایے کہ کس جگہ جانا ہے اور کس وقت جانا ہے۔

میں نے عرض کیا: ان سے پوچھ کر بتاتا ہوں کہ آپ کے وہاں پہنچنے کی کیا صورت ہوگی؟

نستعلیق لہجے اور مہذبانہ اسلوب میں جواب دیا: ''وہاں پہنچنے کی صورت کا کیا مطلب؟'' آپ نے کہہ دیا۔ یہ کافی ہے اور میں چلا جاؤں گا۔

تیسرے دن ان کو لینے کے لیے گاڑی آئی اور وہ چلے گئے۔ تقریر کے بعد جڑاں والا سے ٹیلی فون آیا کہ بہت اچھا پروگرام ہوا اور ہمارے مقرر کی تقریر بہت پسند کی گئی۔ ڈپٹی کمشنر نے اپنی صدارتی تقریر میں موضوع کے متعلق خاص طور سے ان کی بعض باتوں کا حوالہ دیا۔

اگلے دن پروفیسر عبدالجبار شاکر نے ٹیلی فون کیا کہ میں کچھ باتیں کر آیا ہوں لیکن یہ معلوم نہیں کہ ان باتوں کا ضلعے کے اہل کاروں اور دوسرے لوگوں نے کیا اثر لیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ مختصر الفاظ میں منتظمین کا تاثر یہ ہے کہ آپ نے میلہ لوٹ لیا۔

ظاہر ہے انسانی فطرت کے مطابق انھیں خوش ہونا چاہیے تھا اور وہ خوش ہوئے۔

ابھی تک ان سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ یہ سب ٹیلی فونک گفتگو تھی۔ اس سے چوتھے روز ریڈیو پاکستان (لاہور) سے ایک مذاکرے میں شرکت کی دعوت آئی، جس میں پروفیسر صاحب بھی شامل تھے۔ اب ان سے ملاقات کا موقع ملا۔ میانہ قد، سرخی مائل گندمی رنگ، گول چہرہ، کشادہ پیشانی، آنکھوں میں ذہانت کی چمک، شلوار قمیص میں ملبوس، سر پر قراقلی ٹوپی، میٹھی آواز، خوب صورت طرزِ کلام، دل کش اسلوبِ بیان۔

یہ ان سے پہلی ملاقات تھی جو ریڈیو پاکستان لاہور میں ہوئی اور اسی موقع پر پتا چلا کہ وہ بھٹی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ برادری کے نقطۂ نظر سے یہ بات میرے لیے مزید باعث مسرت تھی۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر کے والد مکرم کا اسم گرامی حکیم عبدالعزیز تھا اور وہ دراصل حسین خاں والا (تحصیل پتوکی ضلع قصور) کے رہنے والے تھے۔ دینیات کے عالم تھے اور دارالحدیث رحمانیہ (دہلی) کے فارغ التحصیل۔

عبدالجبار شاکر کی ولادت یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو موضع میر محمد (ضلع قصور) میں ہوئی۔ والد مکرم نے ان کا نام ایک بہت بڑے عالم و صالح بزرگ حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی کے نام پر ''عبدالجبار'' رکھا۔ وہ زندگی کی منزلیں طے کرنے لگے تو اس نام کے جو ''تفاؤلاً'' رکھا گیا تھا۔ بہت سے آثار ان میں نمایاں ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم شام کوٹ اور حسین خاں والا میں حاصل کی۔ بی۔ اے ساہی وال کے گورنمنٹ کالج سے پاس کیا۔ پھر لاہور آ کر پنجاب یونیورسٹی اورئنٹیل کالج میں داخلہ لیا اور ایم اے اردو کے امتحان میں دوئم پوزیشن میں کامیاب ہوئے۔

اس کے بعد ملازمت کا سلسلہ چلا، جس کا آغاز لیاقت پور سے ہوا۔ پھر ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۲ء تک شیخوپورہ کالج میں لیکچرر کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔ ۱۹۸۲ء میں صوبہ پنجاب کی لائبریریوں کے ڈائریکٹر مقرر کیے گئے۔ ۲۰۰۴ء تک اس منصب پر متمکن رہے۔

فیصل مسجد اسلام آباد کی خطابت ایک معززانہ عہدہ ہے جس پر انھیں فائز کیا گیا۔ علمی اعتبار سے اللہ نے انھیں متعدد اعزازات سے نوازا۔ ڈائریکٹر شریعہ اکادمی، ڈائریکٹر جنرل دعوہ اکیڈمی، ڈائریکٹر نیشنل سیرت چیئر۔ یہ نہایت اہم عہدے ہیں جن پر وہ فائز رہے۔

جس زمانے میں وہ پنجاب لائبریریز کے ڈائریکٹر تھے، لائبریریوں کے لیے پرانی کتابیں خریدنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی تھی، جو سات آٹھ ارکان پر مشتمل تھی اس کا ایک رکن مجھے بھی بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار (ڈائریکٹر عجائب گھر لاہور) اور ائیر کموڈور انعام الحق بھی ان ارکان میں شامل تھے۔ ڈیڑھ مہینے کے بعد اس کمیٹی کا اجلاس قائداعظم لائبریری میں منعقد کیا جاتا تھا۔ اس کی کارروائی پروفیسر عبدالجبار شاکر لکھتے تھے۔ اس زمانے میں بہت سی نئی اور پرانی کتابوں کا پتا چلا۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر کو کتابوں سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ اپنی ذاتی لائبریری کے لیے کتابیں خریدتے اور ان کا مطالعہ بڑے اہتمام سے کرتے تھے۔ ان کی لائبریری مختلف و متنوع موضوعات کی ایک لاکھ سے زیادہ کتابوں پر محیط ہے اور اس کا نام انھوں نے ''بیت الحکمت'' رکھا ہے۔ وہ واقعی بیت الحکمت ہے۔ دانائی کا گھر۔ علم و خرد کا دلآویز خزانہ۔ اہل علم کا مرجع۔ یہ کتب خانہ پانچ ہزار مخطوطات کے وسیع ذخیرے پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک ہزار قلمی قرآنِ مجید ہیں جو صدیوں پیشتر مختلف اوقات میں، مختلف ملکوں کے مشاہیر کاتبوں نے مختلف اسالیب کتابت میں لکھے۔ دنیا کی سو سے زائد زبانوں میں قرآنِ مجید کے تراجم اس کتب خانے کی زینت ہیں۔

تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، سفرنامہ، سوانح عمریاں، لغات، ادب و شعر، تنقیدات، شخصیات، سیاسیات، ناول، افسانے، مختلف ملکوں کی تاریخ سے متعلق کتابیں، مقالات۔ غرض ہر موضوع کی کتابیں اس لائبریری میں موجود ہیں۔ پھر بہت سے رسائل و جرائد کے خاص نمبروں کا ایک انبار وہاں دکھائی دیتا ہے۔ ابوالکلام آزاد، اقبال، غالب اور دیگر شخصیات سے متعلق سیکڑوں کتابیں خاص ترتیب کے ساتھ شائقین علم و تحقیق کے لیے اس لائبریری میں رکھی گئی ہیں۔ عربی، فارسی، اردو، ہندی، انگریزی، پشتو، سندھی ہر زبان کی کتابیں اس کتب خانے میں قاری کو ملیں گی۔ اپنی نوعیت کی یہ واحد لائبریری ہے۔

بعض لوگ کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں لیکن ان کے بعد معاملہ کچھ دوسری قسم کا ہو جاتا ہے۔ ایک دن میں نے ان سے گفتگو

کرتے ہوئے دبے لفظوں میں اس صورت حال سے متعلق عرض کیا، تو فوراً جواب دیا میں آپ کی بات سمجھ گیا۔ پھر ایک نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا، اس کتب خانے کی حفاظت اور اس میں اضافے کی ذمہ داری اس نے لے لی ہے۔ یہ نوجوان تھے ان کے صاحب زادے جمال الدین افغانی! باپ کی طرح خوش کلام اور شرافت کا پیکر۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر شستہ بیان مقرر اور شائستہ کلام اہل علم تھے۔ حلاوتِ لسان ان کا شیوہ اور تحمل مزاجی ان پر اللہ کی عطا تھی۔ دھیمے انداز میں بات کرتے اور خوب صورت الفاظ میں اس کو آگے بڑھاتے جاتے۔ فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار انھیں زبانی تھے اور تحریر وتقریر میں بہ وقت ضرورت مناسب مقام پر شعر لکھتے اور پڑھتے۔ زبان کی روانی اور خوش کلامی ان کا ایسا وصف تھا جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

انھوں نے کوئی کتاب تو نہیں لکھی، لیکن مقدمات بہت سی کتابوں پر لکھے، متعدد کتابوں کے فلیپ لکھے۔ ان کے تحریر کردہ مقدمے بڑے جان دار اور مفصل ہیں۔ میری تین کتابوں پر مقدمے لکھے اور تین ہی کے فلیپ سپرد قلم کیے۔ جن پر مقدمے لکھے وہ ہیں:

① ......تذکرہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری ② ......تذکرہ میاں عبدالعزیز مالواڈہ بارایٹ لا اور

③ ......گزر گئی گزران...... نمبر ۲ اور ۳ ادارہ کتاب سرائے اردو بازار لاہور نے شائع کیں، جن کے فلیپ لکھے، وہ ہیں:

① ......قافلہ حدیث ② ......ہفت اقلیم اور

③ ...... برصغیر میں علم فقہ...... نمبر ۳ کتاب بھی ادارہ کتاب سرائے کی طرف سے معرضِ اشاعت میں آئی۔ ''گزر گئی گزران'' چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے جو اکھڑے اکھڑے لفظوں اور بے ربط پیراؤں میں اس فقیر کی ''سرگزشت حیات'' ہے۔ اس پر ان کا مقدمہ اٹھ صفحات کا ہے، مجھے مان لینا چاہیے کہ آٹھ صفحات کا یہ مقدمہ معلومات کی فراوانی اور طرز نگارش کے حسن کے اعتبار سے میرے تحریر کردہ چار سو سے زائد صفحات پر بھاری ہے۔ اور یہ آخری تحریر ہے جو ان کے کلک گہر بار سے نکلی۔ اس کے بعد وہ اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے اور ان کے قلم کی رفتار ہمیشہ کے لیے رک گئی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ ان کے پُر بہار قلم کی آخری نشانی ہے جو وہ میرے اوراقِ پریشان کے حوالے کر گئے۔ اس کا عنوان ''حرفِ اوّل'' رکھا، لیکن درحقیقت وہ ان کی زبانِ قلم کا ''حرفِ آخر'' ہے۔ جی چاہتا ہے، اس مناسبت سے میں اپنی اس کتاب کا نام ''حرفِ آخر'' رکھوں۔ یہ اس لیے بھی کہ یہ زندگی کے آخری دور میں لکھی گئی ہے۔

میں نے ہنسی مذاق میں انھیں کئی دفعہ کہا کہ آپ بے شک ''مقدمہ بازی'' بھی کرتے رہیے، لیکن کسی موضوع پر کوئی کتاب بھی لکھئے۔ میرے خیال میں انھوں نے زیادہ تر مقدمات ''حرفِ اوّل'' کے عنوان سے تحریر کیے ہیں۔ ان کے عزیز القدر صاحب زادوں کو یہ مقدمات کتابی صورت میں شائع کر دینا چاہئیں۔ ان مقدمات میں علم، ادب، تحقیق سب عناصر فراوانی سے پائے جاتے ہیں۔ عام مقدمہ نویسوں سے ہٹ کر انھوں نے مقدمہ نویسی کی ایک نئی طرز سے اہل علم کو روشناس کرایا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف رسائل وجرائد میں ان کے مضامین ومقالات بھی چھپتے رہے ہیں جو بڑے اہم ہیں، انھیں بھی چھاپ دیا جانا چاہیے۔

وہ بہت متحرک اہل علم تھے اور ہر وقت مصروفیات کے ہجوم میں گھرے رہتے تھے، اس لیے کسی خاص موضوع پر کوئی کتاب لکھنے کا انھیں موقع نہیں ملا۔ لیکن ان کے مقدمات اور فلیپ اگر کتابی شکل میں چھپ جائیں تو اصحابِ ذوق یقیناً علم وادب اور تحقیق وکاوش کی ایک نئی کہکشاں سے متعارف ہوں گے۔

میری ان سے شناسائی کا عرصہ کم وبیش بتیس سال کے شب وروز میں پھیلا ہوا تھا۔ جب بھی ان سے ملاقات ہوئی وہ نہایت خندہ پیشانی سے

پیش آئے۔اسلامی تہذیب کا چلتا پھرتا نمونہ اور معاشرتی ثقافت کا حسین مجسمہ تھے۔

انھوں نے علوم دینیہ کسی مدرسے میں خاص تسلسل کے ساتھ نہیں پڑھے۔مختلف اوقات میں مختلف حضرات سے استفادہ کیا۔جن میں جامعہ سلفیہ کے شیخ الحدیث مولانا حافظ عبدالعزیز علوی کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تر ان کا اپنا مطالعہ تھا،جس سے ان کے فکر میں اسلامیت کی جڑیں مضبوط ہوئیں اور دینی حلقوں میں انھوں نے ایک عالم دین کے طور پر شہرت پائی اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسلام آباد کی فیصل مسجد کی خطابت ان کے حصے میں آئی جسے ان کی زندگی کے ایک بڑے اعزاز سے تعبیر کرنا چاہیے۔علمی اور تحقیقی اعتبار سے وہ قدیم وجدید کا دل کش اور خوب صورت مجموعہ تھے۔

چند مہینے پیشتر ادارہ کتاب سرائے کی طرف سے مولانا عبدالغفار حسن کے صاحب زادۂ گرامی ڈاکٹر صہیب حسن کا سفرنامہ ''ابن بطوطہ ہوا کرے کوئی'' کے عنوان سے چھپا۔بہت اچھا نام ہے اور بہت عمدہ انداز میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی روداد سفر قلم بند کی ہے۔یہ سفرنامہ بھی ہے اور اردو ادب وانشا کی ایک خوش کن آبشار بھی ہے۔اس کی تقریب افتتاح اسلام آباد میں پروفیسر عبدالجبار شاکر کے اہتمام میں ہوئی،جس میں مجھے بھی دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔متعدد حضرات نے اس سفرنامے سے متعلق اظہارِ خیال کیا،میں نے بھی چند باتیں کیں۔کچھ عرصے سے میں اکیلا سفر نہیں کرتا،کسی خوش مزاج شخص کو ساتھ لے جاتا ہوں۔اس دن ماہنامہ ''الاخوہ'' کے منیجر حافظ منیر احمد قمر کو ساتھ لے گیا تھا۔شام کے بعد تقریب سے فارغ ہوئے تو پروفیسر عبدالجبار شاکر لاہور کی بس پر سوار کرانے کے لیے خود بس سٹاپ تک ہمارے ساتھ آئے اور خود ہی ٹکٹ لائے۔بس کی روانگی تک ہمارے ساتھ رہے۔چند کتابیں بھی عنایت فرمائیں۔جن میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فارسی ترجمے والا قرآنِ مجید بھی تھا۔

یکم،۲،۳۔اگست ۲۰۰۹ء کو ادارہ تحقیقات اسلامی (اسلام آباد) میں ''جنوبی ایشیا میں اسلامی قانونی فکر اور ادارے'' کے موضوع پر سیمینار ہوا،جس میں مجھے بھی اس موضوع کے کسی پہلو کے متعلق مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی تھی۔اس سیمینار کی مجلس انتظامیہ کے سرکردہ ارکان میں پروفیسر عبدالجبار شاکر کو خاص اہمیت حاصل تھی۔بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ اس سیمینار کے مدیر المہام تھے۔طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے یکم اگست کو مقالہ پڑھا اور میرا یہ پورا دن سیمینار میں تشریف لانے والے اہل علم کی خدمت میں گزرا۔بہت سے حضرات سے ملاقات ہوئی اور ان کے افکارِ عالیہ سے استفادے کا موقع ملا۔اس قسم کے مواقع بہت کم میسر آتے ہیں۔دوسرے دن ۲۔اگست کو ان سے اجازت لے کر میں مری،ایوبیہ اور نتھیا گلی چلا گیا۔ ۳۔اگست کو ان سے ملاقات ہوئی تو کہا کل آپ نہیں آئے۔مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دو پروفیسر سیمینار میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ایک پروفیسر ڈاکٹر ظفر الاسلام اور دوسرے پروفیسر ڈاکٹر مفتی محمد شمیم اختر۔انھوں نے کل مقالے پڑھے اور مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر ظفر الاسلام نے اپنے مقالے کے متعدد مقامات میں آپ کی کتاب ''برصغیر میں علم فقہ'' کے حوالے دیے۔وہ آپ کے متعلق بار بار پوچھ رہے تھے اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔[1]

یہ آخری ملاقات تھی جو پروفیسر عبدالجبار شاکر سے اس سیمینار میں ہوئی۔

میں ۴۔اگست کو لاہور واپس آ گیا۔دو تین مرتبہ ٹیلی فون پر ان سے بات ہوئی۔اردو بازار (کتاب سرائے) میں ان کے صاحب زادوں

---

(۱) میری کتاب ''برصغیر میں علم فقہ'' آج سے ۳۷ سال پہلے ۱۹۷۳ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے لیتھو پر شائع ہوئی تھی۔اب نہایت خوب صورت طریقے سے کمپوز کر کے ادارہ کتاب سرائے اردو بازار لاہور نے شائع کی ہے۔کاغذ،طباعت بہت عمدہ۔

جمال الدین افغانی اور رفیع الدین حجازی سے بھی کئی دفعہ ملاقات ہوئی۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ وہ دل کے مریض ہیں اور ایک دفعہ کوئی آپریشن بھی ہوا تھا۔

۱۳۔ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو گیارہ بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، رسیور اٹھایا تو ماہنامہ ''الاخوۃ'' کے منیجر حافظ منیر احمد قمر کی آواز آئی کہ پروفیسر عبدالجبار شاکر وفات پا گئے۔ یہ ناگہانی خبر تھی، جسے سننے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔لیکن سننا پڑی اور سن کر بے حد افسوس ہوا۔ پھر تھوڑی دیر بعد کئی ٹیلی فون آئے۔ ان کے صاحب زادے جمال الدین افغانی کو ٹیلی فون کیا تو پتا چلا کہ اسلام آباد کے الشفا انٹرنیشنل میں دل کی بیماریوں کے ماہر ڈاکٹر ان کا بائی پاس آپریشن کر رہے تھے کہ آپریشن کے دوران ہی وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کا پہلا جنازہ فیصل مسجد (اسلام آباد) میں پڑھا گیا۔ پھر دوسرا جنازہ رات کو ساڑھے نو بجے کمپنی باغ شیخوپورہ میں جامعہ سلفیہ کے شیخ الحدیث حافظ مسعود عالم نے پڑھایا۔

مرحوم کا دائرہ مراسم بہت وسیع تھا۔ جنازے میں ہر شعبہ ہائے زندگی کے بے شمار لوگ شامل تھے۔ ان کی موت سے علم وتحقیق کا ایک باب بند ہوگیا اور ادب وانشا کو شدید صدمہ پہنچا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ان کا سوگ کس سے کیا جائے۔ وہ سب کے دوست تھے اور ان کی اچانک رحلت پر سبھی سوگ وار ہیں۔ ان سے ملنے اور تعلق رکھنے والوں کے دلوں کے آنگن میں صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔ آیئے سب مل کر ان کے لیے دعا کریں۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ وادخلہ جنت الفردوس ۔



ضروری اعلان

ہفت روزہ الاعتصام لاہور، کی یہ خصوصی اشاعت ہے۔ جو پروفیسر عبدالجبار شاکر مرحوم کے بارے شائع کی جارہی ہے۔ اس خصوصی اشاعت کو دوشمارے (02-01...... جلد 62) تصور کیا جائے۔ اس کی قیمت مبلغ پچیس روپے رکھی گئی ہے۔ قارئین نوٹ فرمالیں۔ [ادارہ]

خادم کی فوری ضرورت ہے

جامع مسجد علامہ احسان ہسپتال گھوڑے شاہ روڈ لاہور، کے لیے خادم کی فوری ضرورت ہے۔ خادم باشرع ہو اور کم از کم فرض نماز پڑھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔

[رابطہ: ابوعمر شیخ محمد نعیم بادشاہ۔ فون: 0306-4460600]

عبدالجبار شاکر

کتاب شناس و کتاب دوست

پروفیسر ڈاکٹر قاری محمد طاہر

لیجیے نوشتہ تقدیر پھر غالب آیا۔ ایک کتاب شناس اور کتاب دوست دنیا سے رخصت ہوا۔ وہی جس کا نام ''عبدالجبار شاکر'' تھا۔ جو واقعی جبار کا بندہ اور جبار کی مشیت پر شاکر رہنے والا اور رضیت باللّٰہ ربا و بالإسلام دیناً کا آئینہ دار تھا۔ اسم با مسمّٰی......اس کی صفت شاکر تھی۔ آج کون ہے جس کی زبان پر مالی عسرت کا گلہ اور مہنگائی کی بات نہ ہو لیکن عبدالجبار شاکر کے شناسا سب شاہد ہیں کہ اس کے لب اس بارے میں گنگ تھے۔ کبھی مالی شکوہ شکایت کی بات نہ کی، اگر کسی نے خود بات کی تو طرح دے گئے۔

میں نے ان کی جوانی بھی دیکھی اور بڑھاپا بھی۔ لیکن دونوں حالتوں میں ان کو جوان نہیں بلکہ نوجوان پایا۔ اس لیے میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ وہ جوانی ہی میں چلے گئے۔ بالوں کی سفیدی بڑھاپے کی علامت ہے لیکن ضروری نہیں کہ بال سفید ہو جائیں تو بڑھاپا آ ہی جائے۔ انھوں نے خود کو کبھی بوڑھا نہ سمجھا، نہ ہی دیکھنے والوں نے ان کو بوڑھا پایا۔ مقصد کی لگن، ہدف کا حصول ان کی زندگی کا اُصول تھا:

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

میرا وہ دوست تھا، آج کا نہیں تقریباً نصف صدی قبل کا۔ شناسائی ۱۹۶۷ء میں ہوئی، جب میں نے اور اس نے اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ہمیں قیام کے لیے وولنر ہاسٹل کا ایک ہی کمرہ الاٹ ہوا۔ ہم دونوں اورینٹل کالج کے طالب علم تھے لیکن وہ اُردو میں تھا، میں عربی میں۔ پہلی ملاقات میں دل نے کہا: کٹھ ملّا ہے، اتنی لمبی داڑھی، لیکن اس نے جس اپنائیت سے گفتگو کی، دل نے خیال جھٹک دیا۔ فکری ہم آہنگی نے فاصلے اور بھی کم کر دیے۔ اس کے بعد قربتیں بڑھتی ہی رہیں اور من تو شدم تو من شدی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ حتیٰ کہ اس کا وقت اَجل آن پہنچا۔

ان کو کتابوں سے محبت نہیں تھی بلکہ عشق تھا اور اس عشق نے جنون کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ایسا جنون جس میں انسان پتھر کھا کر بھی لذت لیتا ہے اور اگر کوئی پتھر نہ مارے تو بدمزہ ہوتا ہے:

میرے جنوں کا تیرے شہر میں گزارا نہیں
مجھے تو ایک بھی پتھر کسی نے مارا نہیں

کتابوں کا جنوں اُنھیں اس وادی میں لے گیا جہاں ہر طرف سے پتھر ہی برستے ہیں۔ اس کے دوست بھی کہتے: شاکر اتنی کتابیں کیا کرو گے، پاگل ہو گئے ہو۔ اس بات کے جواب میں ان کے پاس بس ایک زوردار قہقہہ ہوتا تھا جسے سنتے ہی مخاطب کی پیشانی عرق آلود ہوتی اور زبان خاموش ہو جاتی۔

ان کے ایک مداح نے کتاب لکھی، جس میں ان کے بارے میں کچھ چبھتی باتیں لکھیں۔ شاکر نے گلہ تو کیا جواب دینا بھی پسند نہ کیا۔ وہ راضی

برضائے الٰہی رہا کرتا۔ بس ایک ہی شوق تھا، اچھی سے اچھی کتاب ذاتی کتب خانہ کی زینت بنے۔ اس ذوق کی تسکین کے لیے مالی وسائل پانی کی طرح بہانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔

کتابوں کا شوق ان کو زمانۂ طالب علمی ہی سے پیدا ہو چکا تھا۔ گھر سے پیسے تو ان کو بھی ہماری طرح تھوڑے ہی ملتے تھے لیکن وہ اپنے بیشتر پیسے کتابوں کے خریدنے پر خرچ کرتے تھے۔ انارکلی چوک میں فٹ پاتھ پر رکھی کتابیں ان کی منتظر رہتی تھیں۔ کتاب کے معاملے میں ان کی نگاہیں ہمیشہ عقابی ہوتیں۔ بازار چلتے ہوئے بھی ان کی نگاہ فٹ پاتھ پر بکھری کتابوں پر ہوتی تھی اور چلتے چلتے ایک دم کسی طرف لپکتے۔ پتا چلتا کہ کتاب پر نظر پڑ گئی۔ بس خرید لائے اور ایسی خوشی کا اظہار کرتے کہ اس خوشی کے اظہار کا صحیح بیان ممکن نہیں۔

ان کی کتابوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ ہر ملنے والے کو اپنی کتابوں کی تعداد سے مطلع کرتے اور ایسے خوش ہوتے جس طرح بچہ کھلونا لے کر خوش ہوتا ہے۔ فارسی کا مقولہ ہے: کسبِ کمال کن عزیز جہاں شوی

عبدالجبار شاکر ابھی سرکاری ملازمت سے ریٹائر نہ ہوئے تھے کہ انھیں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی سے ایک خط موصول ہوا کہ آپ ریٹائرمنٹ کے بعد بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد تشریف لے آئیں اور یہاں اپنی صلاحیتوں سے یونیورسٹی میں رنگ بھریں۔ اس خط کا تذکرہ عبدالجبار شاکر مرحوم نے سب سے پہلے مجھ سے کیا اور فرمانے لگے: میں بھائی سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ہمیشہ مجھے طالب علمی زمانہ سے تعلق کے پیش نظر طاہر بھائی کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا: بظاہر تو اس میں کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہیے۔ آپ اپنے گھریلو حالات دیکھ کر قبولیت کا فیصلہ کرلیں۔ فرمانے لگے: میرے ہمراہ گھر چلیں، وہاں مزید مشورہ کرتے ہیں۔ میں نے حامی بھر لی اور ہم ان کے گھر چلے گئے۔ یہ گھر ملتان روڈ پر منصورہ کے بالمقابل واقع ہے۔

ان کے کتابی ذہن کا تو میں ہاسٹل کے مشترکہ قیام کے زمانہ ہی سے قائل تھا لیکن ان کے گھر آ کر اس حوالہ سے مزید اضافہ ہوا۔ یہ گھر تقریباً چودہ مرلہ جگہ پر محیط ہے جو تین چار منزلہ ہے۔ اور ہر منزل پر چاروں طرف الماریاں ہیں جن میں کتابیں بلکہ کتابیں ہی کتابیں رکھی ہیں۔ دیواروں کے درمیان فرش پر بھی الماریاں قطاروں میں کھڑی تھیں۔ ان الماریوں میں بھی کتابیں ہی تھیں۔ انھوں نے اپنے ذوق کے مطابق ترتیب کچھ اس طرح قائم کی کہ اوپر کی منزل ساری قرآن، تفاسیر اور متعلقاتِ قرآن کتابوں کے لیے۔ دوسری منزل حدیث اور متعلقاتِ حدیث کی کتب کے لیے، تیسری منزل میں فقہی کتب اور چوتھی منزل ادبی کتابوں کے لیے مخصوص تھی۔ وہ مجھے چاروں منزلوں میں لے گئے اور بڑی محبت سے اپنی کتب دکھاتے رہے۔ خوش ہوتے رہے اور خوش کرتے رہے۔

میں نے پوچھا: رہائش کس منزل میں ہے؟ فرمایا: ان چاروں منزلوں ہی میں ہے۔ کام کرتے کرتے جہاں نیند آ جاتی ہے، سو جاتا ہوں۔ میں نے بیڈروم، ڈرائنگ روم، گیسٹ روم وغیرہ کے جھنجھٹ نہیں پالے۔ میں نے پوچھا، اہل خانہ کہاں ہیں؟ فرمایا، شیخوپورہ میں ہیں۔ میں نے پوچھا: کب واپس آئیں گے؟ بولے: وہ تو مستقل وہیں رہتے ہیں۔ کیوں کہ میں مکان اور مکین شفٹ کرنے کا قائل نہیں ہوں، اس میں بڑی الجھن ہوتی ہے۔ میں بیوی بچوں کو لاہور لایا ہی نہیں۔ وہ تو آبائی گھر ہی میں رہتے ہیں۔ میں نے بے تکلفی سے کہا: بھلے آدمی لوگ گھر اہل خانہ کے لیے تعمیر کرتے ہیں، تم نے اگر اہل خانہ کو شیخوپورہ ہی میں چھوڑنا تھا تو گھر کس کے لیے تعمیر کیا۔ وہ فرمانے لگے: میں نے گھر کتابوں کے لیے تعمیر کیا ہے۔

ایک سادہ سا پلنگ، اس پر چادر بچھی تھی، اس پر مجھے لیٹنے اور آرام کرنے کا حکم دیا۔ میں تعمیل حکم میں لیٹ گیا۔ عبدالجبار شاکر خود ایک مصلیٰ بچھا کر فرش پر لیٹے۔ کچھ باتیں ہوتی رہیں، کچھ زمانۂ طالب علمی کے وقت ہوسٹل میں مقیم ساتھیوں کا تذکرہ آیا، کچھ سیاست دوراں کی باتیں بھی ہوئیں۔

لیکن ہر بات کی تان کسی نہ کسی حوالے سے کتاب اور مطالعہ کتاب، یا کسی کتاب پر گفتگو سے شروع ہوئی اور اسی موضوع پر ختم ہوئی۔

انہی باتوں کے دوران انھوں نے ایک دلچسپ قصہ بھی سنایا۔ کہنے لگے: شیخوپورہ میں کسی وجہ سے مکان تبدیل کرنا تھا۔ میں نے اپنی ساری کتب کو گتے کے ڈبوں میں پیک کیا اور رسیوں سے باندھا۔ ایک ریڑھی والے کو بلایا، اس سے پیسے طے کیے۔ ریڑھی والے نے سامان منتقل کرنا شروع کیا۔ وہ دو تین چکر لگا چکا، ہر چکر میں کتابوں کے بنڈل، وہ کتب سے بھرے ہوئے گتے کے بنڈل اٹھاتا رہا۔ چوتھے چکر میں حیرت سے پوچھنے لگا، مولانا! آپ کے گھر میں کچھ گھریلو سامان، کوئی برتن وغیرہ بھی ہے یا آپ نے ساری ردّی ہی جمع کر رکھی ہے۔ اس واقعہ سے ہم دونوں نے خوب لذت لی۔

جواب آں غزل کے طور پر میں نے بھی اپنا واقعہ بتایا۔ ہمارے گھر ایک بوڑھی خاتون عرصہ سے کام کرتی تھیں۔ بہت خاموش طبع، کسی محلے دار نے اس خاتون سے ایک روز پوچھا، یہ قاری صاحب کیا کرتے ہیں۔ بولی: میں تو گھر میں کام کرتی ہوں۔ میری عادت نہیں کہ میں کسی کے گھریلو معاملات میں دخل دوں۔ یہ اچھی بات نہیں، میں تو خاموشی سے آتی ہوں، کام کرتی ہوں، چلی جاتی ہوں۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ ان کا ردّی کا کاروبار ہے۔ ایک پورا کمرہ ردّی سے بھرا پڑا ہے۔ انھوں نے واقعہ سنا اور لذت لیتے رہے۔

ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا: شاکر! تمہارے بیوی تو تم سے بہت نالاں رہتی ہوگی۔ سارے پیسے کتابوں پر ہی خرچ کر دیتے ہو۔ بولے، طاہر بھائی! شاید تمہاری بات درست ہو لیکن میں شاکر ہوں تو میری بیوی مجھ سے زیادہ شاکرہ ہے، کتابوں کی قدر دان ہے۔ اس نے میرے ذوق کی تسکین کے لیے اپنا زیور بیچ کر رقم میرے ہاتھ میں دی اور کہا: اپنی مرضی کی کتب خرید لیں اور لائبریری کی زینت بنا دیں، مجھے خوشی ہوگی۔

وہ ایک مرتبہ مجھے ملنے فیصل آباد آئے۔ میں نے خوشی کا اظہار کیا، بٹھایا، باتیں ہوئیں۔ باتوں کے ساتھ ساتھ الماری میں رکھی کتابوں کو دیکھتے رہے بلکہ کتابوں کو کھولتے رہے۔ ان سے کھیلتے رہے۔ کھیلنے کا لفظ محض مترادفات یا لفظی تصنع کے لیے نہیں، اظہارِ حقیقت کے طور پر ہے۔ کتاب دیکھتے ہی پہلے ان کا چہرہ کھلتا ہے۔ پھر وہ کتاب کھولتے اور پھر اس سے کھیلتے تھے۔ کھیلنے کا لفظ یہاں بھی لفظی تصنع نہیں بلکہ کتاب کو دیکھ کر ان کی ظاہری کیفیت اور چہرہ پر پھیلتی بشاشت کے حوالے سے ہے۔ ان کے چہرے پر بکھرتی خوشی بالکل ایسی ہی ہوتی جس طرح بچے ہر نئے کھلونے کو دیکھ کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ رخصت ہونے لگے تو فرمائش کی کہ اس ذخیرہ کتاب سے بس ایک اپنی پسند کی کتاب کا ہدیہ چاہتا ہوں۔ اس سوال میں اتنی اپنائیت تھی کہ میں انکار نہ کر سکا۔ اگلے روز اس واقعہ کا ذکر ایک مشترک دوست نے کیا۔ کہنے لگے: عبدالجبار شاکر کی سب سے بڑی کمزوری کتاب ہے۔ کتاب دیکھ کر مچل جاتا ہے۔ اس معاملہ میں ضد کی حد تک حریص ہے، لیے بغیر نہیں چھوڑتا۔

''بیت الحکمت'' کے نام سے ان کی قائم کردہ لائبریری ان کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ ان کی زندگی میں بھی تحقیقی کام کرنے والے طلباء و اساتذہ یہاں سے علمی فیض حاصل کیا کرتے تھے۔ کتابوں کے سمندر میں غواصی کر کے علمی موتی تلاش کرتے اور اپنی تحقیق کے ذریعے ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کیا کرتے تھے۔ بلکہ بڑے بڑے قلمکار، کالم نگار بجا طور پر یہ کہتے کہ جو کتاب کہیں سے نہ ملے وہ عبدالجبار شاکر کے بیت الحکمت سے ضرور مل جاتی ہے۔

عبدالجبار شاکر شعور و بلوغ کے آغاز ہی سے تحریکی ذہن کے حامل تھے۔ غالبًا یہ ذہن انھیں ورثہ میں ملا تھا، جس کی آبیاری پاکستان میں موجود مختلف دینی تحریکات نے کی۔ زمانہ طالب علمی میں وہ جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی ؒ کی فکر سے متاثر تھے، بلکہ خاصے متاثر تھے۔ اگرچہ وہ باقاعدہ اس تحریک کا حصہ تو نہ بنے لیکن فکری اعتبار سے وہ فکر مودودی کے بہت بہت قریب تھے۔ نجی گفتگو میں مولانا مودودی ؒ کا حوالہ دیتے، جس میں عقیدت مندی غالب ہوتی تھی اور مولانا کی کتب بھی جمع کرتے تھے اور دوسروں کو پڑھنے کی ترغیب بھی دیا کرتے تھے۔

یہ تحریکی ذہن ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ تاریخ میں گزری ان شخصیات سے خاصے متاثر تھے جن کا حوالہ تبلیغی اور تحریکی رہا ہے۔ مثلاً سید جمال الدین افغانی، حسن البنا، سید قطب، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالقادر وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ شادی کے بعد جو اثمار ہائے لذیذہ اولاد کی شکل میں اللہ نے انھیں عطا فرمائے ان کے نام بھی انھوں نے انہی عظیم شخصیات کے نام پر ہی رکھے۔ بڑے بیٹے کا نام جمال الدین افغانی، چھوٹے کا نام رفیع الدین۔ جب کوئی ان سے بیٹوں کے نام پوچھتا تو بڑی محبت سے نسبت کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کرتے تھے۔ ان بڑی شخصیات کا نام بتاتے ہوئے ان کے چہرہ پر ایک محبت وعقیدت کی کیفیت کے آثار نمایاں ہوا کرتے تھے۔

وہ محرک اور متحرک زندگی کے قائل تھے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا ان کے لیے پاپ سے کم نہ تھا۔ سست روی ان کا مذہب نہ تھی۔ کچھ نہ کچھ کرنا، کرتے رہنا اور دوسروں کو کچھ نہ کچھ کرنے کی ترغیب دینا، زندگی بھر معمول رہا۔ تیز چلتے، دوسروں کو تیز روی اختیار کرنے کی ترغیب دیتے۔ ایسے افراد کا شمار شاید مشکل ہو جو ان کی تحریک سے قلمکار بنے اور نام کمایا، زندگی کی یہی روش انھوں نے اپنی اولاد میں بھی منتقل کی۔ آپ کو انہی لوگوں سے پیار تھا جو تاریخ میں متحرک رہے اور متحرک زندگی گزار کر رخصت ہوئے۔

شگفتگی ان کی طبیعت کا حصہ تھی۔ جس سے ملتے مسکراتے ملتے۔ دیکھتے ہی کھل جاتے اور کھل کر باتیں کرتے۔ خود بھی مسکراتے، دوسروں کو بھی کسی نہ کسی حوالہ سے مسکرانے پر مجبور کرتے۔ مخاطب خواہ کتنا ہی سنجیدہ مزاج ہو، ایسی بات کرتے کہ سننے والے کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ ان کا یہ عمل رسالت مآب ﷺ کے فرمان کی تعمیل میں ہوتا تھا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''دوسرے سے مسکراتے چہرہ سے ملنا بھی نیکی ہے۔'' [ترمذی: ۱۹۷۰]

وہ پیدائشی اہل حدیث تھے: پوری لمبی داڑھی، ٹخنوں سے اونچی شلوار پہنتے۔ کبھی ننگے سر نہ رہتے۔ زمانہ طالب علمی میں بھی شلوار ٹخنوں سے اوپر رہی۔ سر کا حلق کروایا اور چہرہ کو داڑھی سے مزین کیا۔

ستر کی دہائی میں کالجوں یونیورسٹیوں میں انگریزی لباس کا چلن تھا۔ مشرقی لباس پہننے والے کو دیگر طلبا اچھوت سمجھتے یا وہ خود ہی کو اچھوت خیال کرتے۔ عبدالجبار شاکر کو ہمیشہ مشرقی لباس ہی میں دیکھا۔ وہ میرے روم میٹ تھے۔ ایک برس ہم ایک ہی کمرے میں رہے۔ انہوں نے کبھی پتلون نہ پہنی لیکن اسکے باوجود مجھے پتلون پہنے دیکھتے تو ناصحانہ انداز میں مسکراتے۔ ہمیشہ تعریف کی، یہ حکمت سے بھرپور مبلغانہ طریقہ تھا جس میں ﴿ادْعُ اِلٰی سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ﴾ [النحل: ۱۲۵] کا پہلو کارفرما تھا۔ اپنے لباس اور اپنی ظاہری ہیئت پر میں نے ان کو کبھی احساس کمتری کا شکار نہ پایا۔

اہل حدیث ہونے کے ناتے وہ جہر اور رفع یدین کے قائل تھے۔ صرف نماز ہی میں نہیں بلکہ سٹیج پر تقریر کے دوران بھی خوب جہر سے کام لیتے اور رفع یدین بھی کرتے تھے۔ یہ عادت باہم گفتگو میں بھی غالب رہتی۔ ان کی اس عادت کی وجہ سے مخالف بہت جلد قائل ہو جاتا پکے وہابی تھے، البتہ مزاج میں سختی اور کھردرے پن کا نام نہ تھا۔

دوستوں کے ساتھ انتہائی شفیق، محبت کا مورد، سخت سے سخت بات بھی اس انداز میں کہہ گزرتے جیسے شوگر کوٹڈ گولی۔ مخاطب کو احساس ہی نہ ہوتا، لیکن اہل حدیث مسلک پر پختہ کار ہونے کے باوجود دوسروں کی بات توجہ سے سنتے۔ اپنی سے ہٹتے نہ تھے لیکن ہر ایک کی سنتے اچھی مانتے، غلط کا دلیل سے توڑ لانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تعلقات بریلوی، دیوبندی اور شیعہ مسلک کے لوگوں کے ساتھ بھی تھے۔ اس معاملے میں ان کا عمل قرآنی تعلیم ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾ [المائدہ: ۲] کا آئینہ دار تھا۔ وہ مخاطب کی بات میں وزن دیکھتے تو تقوی کی کسوٹی پر پرکھتے اور جذبۂ بر کے تحت تعاون میں قطعاً گریز نہ کرتے تھے۔

ایک روز دوستوں میں دوران گفتگو مسلکی بحث چل نکلی۔ بریلوی مکتب فکر کی بعض باتیں زیر تبصرہ تھیں۔ کچھ اس مسلک کے ساتھی بھی تھے۔ وہ دفاعی کوشش کرتے رہے لیکن لاجواب ہوئے۔ عبدالجبار شاکر بولے: طاہر بھائی! چھوڑیئے، آپ عقل کی باتیں کرتے ہیں۔ عشق ومحبت کی باتوں میں عقل پیچھے رہ جاتی ہے۔ عقل عشق کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ عشق سر پھوڑ لیتا ہے، عقل تکتی اور غور کرتی رہتی ہے۔

بلا کے مقرر تھے۔ کالجوں یونیورسٹیوں میں منعقد ہونے والے ہر مباحثہ میں شریک ہوتے اور ہمیشہ میلہ لوٹ کر ہی واپس لوٹتے۔ تالیوں کی گونج میں سٹیج پر آتے اور تالیوں کی گونج ہی میں سٹیج سے اُترتے تھے۔ لیکن پہلی تالیاں تقریر اوران کے انداز پر نہیں بلکہ ان کی ظاہری ہیئت کو دیکھ کر بجائی جاتی تھیں۔ جن میں طنز، ہاؤ ہو اور شور وغوغا ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ زبان کھولتے، موضوع پر گفتگو کرتے تو پورے مجمع پر سناٹا طاری ہوجاتا۔ جادو کی کیفیت محسوس ہوتی۔ آخر میں یہ جملہ ضرور کہتے: جناب صدر! میں انہی دلائل وبراہین کی روشنی میں آج کی قرارداد کی مخالفت/موافقت کرتا ہوں اور سٹیج چھوڑتے۔ اس وقت بھی تالیاں بجتیں لیکن یہ تالیاں سٹیج پر آنے کی تالیوں سے مختلف ہوتیں۔ ان میں تحسین وتعریف کا غلبہ ہوتا تھا۔ کسی مباحثے میں کسی بھی بڑے سے بڑے مقرر طالب علم کی عبدالجبار شاکر کے سامنے دال نہ گلتی۔

یہ شروع شروع کی بات ہے: میں نے پوچھا، شاکر صاحب! آپ کو جب کسی مباحثے میں سٹیج پر بلایا جاتا ہے تو آپ کے تاثرات کیا ہوتے ہیں۔ سٹیج کے خوف سے اعصاب پر کچھ اثر ہوتا ہے یا نہیں؟ بولے، سٹیج نام کی چیز میرے لیے اعصاب شکن نہیں۔ سٹیج کا خوف ان کے لیے کبھی پریشان کن نہیں ہوا۔ ایک روز باتوں ہی باتوں میں خود ہی کہنے لگے: جب میرا نام تقریر کے لیے پکارا جاتا ہے اور میں اُٹھ کر سٹیج پر جاتا ہوں تو طلباء میری ظاہری حالت، قمیص، شلوار، ٹوپی اور داڑھی کو دیکھ کر خوب ہنستے اور آوازے بلند کرتے ہیں، سیٹیاں بجاتے ہیں۔ اسی ہاؤ ہو میں میری تقریر شروع ہوتی ہے۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد تمام ہنسنے والے سنجیدہ بلکہ انتہائی سنجیدہ ہوجاتے ہیں اور مباحثہ کا فیصلہ میرے حق میں ہوجاتا ہے۔

زمانہ طالب علمی عجیب بھی ہوتا ہے اور غریب بھی۔ خصوصاً یونیورسٹی سطح کا دور تو زندگی کے لیے عجائب وغرائب میں اور بھی اضافہ کرتا ہے۔ کیوں کہ اس میں شباب وعناب کی رنگینیاں ہوتی ہی ہیں اور ہوسٹل کی زندگی اس کو دوآتشہ کرنے میں مدومعاون بنتی ہے۔ ایسے عالم میں بعض طالب علم شباب کے ساتھ عناب کے رسیا ہونے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ قانون کے شباب تو کسی قانون کی پروا بھی نہیں کرتے اور بہت سی حدود پھلانگ جاتے ہیں۔ کیوں کہ انھیں کسی عتاب کی بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ وہ قانون کو اپنا غلام اور عدالت کو باندی خیال کرتے ہیں۔

وولنر ہال کے ساتھ ہی لاء کالج کا ہاسٹل بھی ہے۔ وہاں مذکورامثلہ کی فراوانی ہوتی ہے۔ مشرقی علوم کے بعض طلباء بھی بہک جاتے ہیں لیکن بہت کم۔ عبدالجبار شاکر بھی وولنر ہاسٹل کے باسی اور لاء کالج ہاسٹل کے قریب تھے۔ ان میں شباب اور جمال بھی تھا اور سخن وری کا کمال بھی۔ لیکن ان کے ہاں شباب کے ساتھ عناب نہیں، بلکہ ''اناب الی اللہ'' کی کیفیت تھی۔ ان کی راتیں بھی جاگتی تھیں لیکن رجوع الی الرحمٰن کے ساتھ...... ان کے نینوں میں بھی مستی ہوتی تھی لیکن دعاے نیم شبی کی...... ان کی آنکھیں بھی اشک بار ہوتی لیکن کسی فراق میں نہیں بلکہ عتاب الٰہی اور خشیت وتقویٰ کی کیفیت سے...... وہ بھی راتوں کو لاہور کی سڑکوں پر گھومتے تھے لیکن آوارہ نہیں بلکہ دینی لٹریچر کو تقسیم کرتے ہوئے۔

وہ خود تحریکی ذہن کے مالک تھے۔ اس لیے انھیں تاریخ میں انہی شخصیات سے رغبت تھی جنھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین اعلائے کلمۃ اللہ قرار دے لیا تھا۔ وہ کلمۃ اللہ کو بلند کرتے ہوئے دنیا میں زندہ رہے اور اس کام کو کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کا نصب العین ہی یہ تھا کہ اعلائے کلمۃ اللہ کرتے کرتے مرنا ہے اور یہی کام مرتے مرتے کرنا ہے۔ اس حوالے سے زندہ شخصیات میں وہ سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ سے متاثر تھے۔ ان کے اقوال کو گفتگو میں بیان کرتے۔ اس قلبی موانست کے باوجود وہ وسیع المشرب تھے۔ اہل حدیث ہونے کے ساتھ ساتھ بریلوی اور

دیوبندی اکابر کا انتہائی احترام سے نام لیتے۔ اگر کسی شخصیت کے تذکرہ میں سیاسی وابستگی کے حوالے سے ذمّ کا پہلو سامنے آتا تو انتہائی ادب سے اس انداز میں ذکر کرتے کہ مخاطب ڈھیر بھی ہوتا اور زخم کا اندازہ بھی نہ ہو پاتا۔ وار کا احساس کچھ وقت گزرنے کے بعد ہی ہوتا۔ لیکن اس وقت تک چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ اس وقت تک مخاطب جواب دینے کی صلاحیت سے عاری ہوتا۔

ان کا تعلق شیخوپورہ سے تھا اور اہل حدیث گھرانہ کے فرد تھے۔ یہاں کے اہل حدیث حضرات ابلاغ کے لیے ٹھیٹھ پنجابی کو ذریعہ بنایا کرتے حتی کہ سٹیج پر بھی پنجابی ہی بولتے ہیں۔ اگر کبھی انھیں تکلفاً اُردو میں گفتگو کرنی پڑ جائے تو زبان لڑکھڑاتی اور سننے والے کو کذب کا گمان ہونے لگتا ہے لیکن عبدالجبار شاکر کے ہاں یہ کیفیت نہ تھی۔ اُردو زبان اس شستہ انداز میں روانی سے بولتے کہ سننے والے کو اہل زبان ہونے کا گمان گزرتا۔ ان کی تقریر میں الفاظ کی ندرت بھی ہوتی اور اندازِ بیان میں شہد کی سی شیرینی پائی جاتی تھی کہ سننے والا مسحور ہو جاتا۔ کان لذتِ کلام سے اس درجہ مسحور ہوتے کہ سننے والا اپنی کم اور ان کی زیادہ سننے پر مجبور ہو جاتا۔ بلکہ ان کی ہی سنتے رہنے کو ترجیح دیتا تھا۔

شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال ؒ سے منسوب ''مرکزیہ مجلس اقبال'' کا قیام تقریباً پون صدی قبل ہی عمل میں آ گیا تھا۔ تشکیل پاکستان کے بعد ہر سال یومِ اقبال کی تقریب پابندی سے منعقد ہوتی ہے جس میں اہل فکر و اہل دانش اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اقبال پسند جوش و جذبے سے اس تقریب میں شریک ہوتے ہیں۔ شعلہ بار خطیب، آتش فشاں مقرر اور ہفت روزہ چٹان کے ایڈیٹر جناب آغا شورش کاشمیری مرحوم عمر بھر مرکزیہ مجلس اقبال کے سیکرٹری رہے۔ تقریب میں سٹیج سیکرٹری کے فرائض ہمیشہ وہی ادا کیا کرتے تھے۔ ان کی شخصیت جادو اثر رکھتی تھی۔ الفاظ کا چناؤ اور اندازِ خطاب دلکش نہیں بلکہ مسحور کن ہوتا تھا۔ اپنی جولانی طبع سے پوری تقریب میں رنگ بھر دیتے تھے۔ موقع و محل کے مطابق اشعار کا انتخاب پیش کرنے کا انداز تقریب کی رونق کو دوبالا کر دیتا۔ وہ اپنی تقریر سے انسانوں کے بپھرے طوفان کو جامد کرنے اور جامد لوگوں کا جمود توڑ کر بپھرے ہوئے طوفان میں تبدیل کر دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ حاضرین دم بخود ہو کر آغا شورش کی باتیں سنا کرتے تھے۔

ان کے انتقال کے بعد مرکزیہ مجلس اقبال کی تقاریب میں وہ رنگ نہ رہا۔ چند برس یہ تشنگی رہی۔ ہر شخص آغا صاحب کو یاد کیا کرتا تھا۔ چند برس اسی طرح گزر گئے، جانے انتخاب کس کا تھا۔ تاہم نقابت کی ذمہ داری عبدالجبار شاکر کے سپرد ہوئی۔ انھوں نے کوثر و تسنیم میں دہلی، دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کی مجموعی شستہ اور سریلی اُردو سے حاضرین کو دنگ کر دیا۔ عبدالجبار نے صحیح معنوں میں آغا شورش کی یاد تازہ کی اور نقابت میں آغا جی کی نیابت کا حق ادا کر دیا اور مجلس اقبال کی سابقہ رونقیں پھر لوٹ آئیں۔ عبدالجبار شاکر کے بعد اب اس خلا کو کون پر کرے گا۔ دور و نزدیک فوری طور پر ایسی کوئی شخصیت دکھائی نہیں دیتی۔

عبدالجبار شاکر کی طبیعت میں سادگی کا وہ عالم تھا کہ اسلاف کی یاد تازہ ہو جاتی۔ ہمارے ہاں کئی برس سے پابندی کے ساتھ درسِ قرآن جاری ہے۔ ہفتہ میں صرف ایک بار جمعہ کی شب مغرب سے عشاء کی نماز تک۔ علمی زوال کا عالم کہ یہ ذمہ داری میرے سپرد ہے۔ ایک پارے کے اختتام پر کسی اہل علم کو دعوت دی جاتی ہے جو اپنے وعظ سے مستفیض فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ عبدالجبار شاکر کو دعوت دی گئی۔ فوراً قبول فرمائی، بروقت تشریف لائے۔ درس دیا اور حاضرین سے خطاب کیا۔ کچھ ادبی دوست ملنے آ گئے تو محفل دیر تک جمی۔ علمی، تحقیقی اور تجسس بھری باتیں بھی ہوئیں، ادبی چٹکلے بھی چلے۔ معروف ادیب و استاد ڈاکٹر انور محمود نے ان کی گفتگو پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ شاکر صاحب کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان میں گویا ہوتے ہیں۔ ان کی گفتگو سے لذتِ سماعت کا احساس بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ آرام کے لیے غریب خانہ پر انتظام تھا۔ اے سی والے کمرے میں بستر لگایا۔ فرمانے لگے: طاہر بھائی! ایسے تکلّفات میں نے نہیں پالے۔ تمہارے مکان پر چھت ہے نا۔ میں نے عرض کی: شاکر بغیر چھت کے کون سا مکان ہوتا

ہے؟ ہنس دیئے، بس تو میں چھت پر سوؤں گا۔ میں نے اے سی والے کمرے میں سونے پر اصرار کیا، انکار ہی آیا۔ میں نے آخری دلیل دی، کہا: چھت پر مچھر کاٹیں گے۔ بولے: حقیر مخلوق ہے، اپنے حصہ کا رزق ہمارے جسم سے لے لیں، کیا حرج ہے۔ میں لاجواب ہوا، چھت پر لے گیا، چارپائی بچھائی۔ میں نے کہا: رکیے ابھی بستر لاتا ہوں۔ کہنے لگے: ضرورت ہی نہیں۔ بولے: وہ شعر نہیں پڑھا ع

وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

قدرت کی طرف سے سرہانا جسم کا حصہ ہے، اس لیے حاجت ہی نہیں۔ میں بھاگم بھاگ نیچے آیا، بستر اٹھایا، اوپر چھت پر پہنچا تو شاکر صاحب سنت کے مطابق دائیں کروٹ سر کے نیچے بازو رکھے گہری نیند سو چکے تھے۔ میں نے بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا۔

عبدالجبار شاکر سے میری ٹیلی فون پر گفتگو ان کے انتقال سے ہفتہ عشرہ قبل ہوئی۔ وہ مجھے میری کتاب ''تذکارِقراء'' کی طباعت کی اطلاع کے ساتھ مبارکباد دے رہے تھے۔ مذکورہ کتاب ان کے بیٹے رفیع الدین نے شائع کی تھی جو ''نشریات'' کے نام سے ایک طباعتی ادارہ چلا رہے ہیں۔ فرمانے لگے: کتاب چھپ چکی ہے، صرف جلد بندی کے مراحل باقی ہیں۔ ایک ہفتہ کے دوران اس مرحلے کی تکمیل بھی ہو جائے گی۔

عبدالجبار شاکر کا ایک وصف یہ تھا کہ وہ علمی کام کرنے کی تحریک ضرور دیتے تھے۔ فرمانے لگے: آئندہ کس موضوع پر کام کرنے کا ارادہ ہے۔ میں نے عرض کی: ارادہ نہیں بلکہ بہت سا کام مکمل ہے۔ مجودِ اوّل و اعظم محمد ﷺ کے عنوان سے رسالت مآب ﷺ کی ان مساعی اور فرمودات نیز آپ ﷺ کا اندازِ تلاوت اور آپ کی تلاوت کے سحر پر کافی کچھ لکھ چکا ہوں، تھوڑا کام باقی ہے۔ سنتے ہی انتہائی خوشی کا اظہار کیا اور کہا: یہ موضوع تمہارا ہی ہوسکتا تھا۔ یقیناً موضوع کا حق ادا ہوگا۔ پھر فرمانے لگے، طاہر جلد تکمیل کیجیے۔ بھائی کی اس کتاب پر مقدمہ میں خود لکھوں گا اور نشریات ہی شائع کرے گا اور سیرت کے صدارتی ایوارڈ کے لیے کتاب پیش کی جائے گی۔ لیکن ایک احتیاط ضرور ملحوظ رکھیے: آیات و احادیث کی صحت بہت ضروری ہے۔ کتاب خواہ کتنی ہی اچھی ہو، ہمارے بعض کرم فرما اس حوالے سے کتاب مسترد کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے عرض کی، مقدور بھر کوشش کروں گا۔ یہ میرے ساتھ ان کی آخری گفتگو تھی۔ ''تذکارِقراء'' طبع ہو کر پہنچی تو دو روز بعد ہی اخبار میں خبر تھی، عبدالجبار شاکر چل بسے۔ دل گرفتہ ہوا، کاش ''جیتا کچھ دن اور۔'' میری خوشی کو دوبالا کرتا، کتاب کی تقریب شناسائی میں شریک ہوتا۔ اپنی مسجع و مقفی گفتگو سے ''تذکارِقراء'' کو مزید اجالتا۔ لیکن قرآن کا فیصلہ اٹل و حتمی:

﴿ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [یوسف:۲۲۱]

''لوگ اس حقیقت سے کتنے بے بہرہ ہیں کہ اللہ ہی کا فیصلہ ہمیشہ غالب آ کر رہتا ہے۔''

لوگ گھر بیوی بچوں کے لیے بناتے ہیں۔ انھوں نے گھر بیوی بچوں کے لیے نہیں بلکہ کتابوں کو جمع کرنے کے لیے بنایا۔ وہ کتابیں جمع نہیں کرتے بلکہ کتابوں کو پالتے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک انسان اپنی اولاد کی پرورش کرتا ہے۔ ان کا کتب خانہ ان گنت کتابوں کا مجموعہ ہے۔ اسے انھوں نے ''بیت الحکمت'' کا نام دیا۔ یہ ''بیت الحکمت'' اپنی بعض خصوصیات میں پاکستان کی بڑی سرکاری و غیر سرکاری لائبریریوں کو شرماتا ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ ہندوستان کے شہر پٹنہ میں ایک بڑی لائبریری ہے جس کا شمار دنیا کی اہم لائبریریوں میں ہوتا ہے بلکہ شہر پٹنہ کی وجہ شہرت اسی بڑی لائبریری ہی کی رہین منت ہے۔ جو ''خدا بخش لائبریری پٹنہ'' کے نام سے موسوم ہے۔ خدا بخش بھی کتابوں سے محبت کرنے والا عام انسان تھا۔ پیشہ کے اعتبار سے سول جج کے عہدہ پر فائز تھا۔ مہینہ کے بعد حق الخدمت کے طور پر جو تنخواہ ملتی، اس میں سے اپنی گزر اوقات کے پیسے رکھ کر بقیہ کی کتابیں خرید لیتا اور اپنے گھر کی الماریوں میں سجا لیتا تھا۔ بوقت انتقال یہی ذخیرہ اس کی وراثت تھا۔ کتابوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ اس کا انتظام و انصرام حکومت وقت کو سنبھالنا پڑا۔ اس وقت سے یہ لائبریری حکومت ہند کی تحویل میں ہے اور اسی عظیم شخصیت خدا بخش کے نام سے موسوم ہے جس

میں کتابوں کی تعداد لاکھوں کو چھو رہی ہے۔ دنیا میں طبع ہونے والا کوئی جرنل ایسا نہیں ہے جو اس لائبریری میں موجود نہ ہو۔

عبدالجبار شاکر کی وراثت بھی درہم ودینار نہیں بلکہ وہ عظیم لائبریری ہے جو اس نے اہل علم اور اہل پاکستان اور اپنی اولاد کے لیے ورثہ میں چھوڑی ہے۔ یقیناً ان کی صلبی اولاد اس ذخیرہ کی شرعاً وارث ہے۔ احتیاط کا تقاضا ہے کہ عبدالجبار شاکر کا یہ عظیم علمی ورثہ ایسے شکاریوں کے ہتھے نہ چڑھے جو کتابوں کو سیروں اور منوں میں تولتے ہیں اور مال کھرا کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ ہم نے بڑے بڑے اہل علم کی کتابوں کو فٹ پاتھ پر فروخت ہوتے دیکھا ہے اور بعض عظیم لکھاریوں کی کتابیں ردّی کے بیوپاریوں کے ہاں دیکھی ہیں۔ جو پھر پنساریوں کے ہتھے چڑھیں اور انھوں نے ان کے لفافے بنائے اور ان میں ٹڈی مار پوڈر اور چوہے مار گولیاں باندھنے سے بھی گریز نہ کیا۔ عبدالجبار شاکر کی لائبریری اب ایک خزانہ ہے جس کا پہرہ دینا ضروری ہے۔ اگر اس پہرہ کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا تو یقیناً یہ علمی ورثہ مرحوم کی طرف سے صدقہ جاریہ ہوگا جو قیامت تک ان کے حسنات میں اضافہ کرتا رہے گا۔

عبدالجبار شاکر انتہائی امین تھے۔ کسی کے الفاظ تک کو امانت خیال کرتے۔ ایک ملاقات میں تذکرۂ عالم اسلام کی حالت زار پر چل نکلا۔ اس وقت پاکستان کے صدر جناب رفیق تارڑ تھے۔ ان سے عبدالجبار شاکر کی گاڑھی چھنتی تھی۔ جانے یہ محاورہ کس طرح اردو والوں میں چل نکلا۔ حالاں کہ مشاہدہ یہ ہے کہ جو گاڑھی ہو، وہ تو چھنتی ہی نہیں لیکن ہمیں اس سے کیا غرض، یہ اردو والوں کا کام ہے، وہ جانیں۔ بہرحال عبدالجبار شاکر کے ساتھ رفیق تارڑ کی دوستی گاڑھی تھی، اتنی گاڑھی کہ چھنتی ہی نہ تھی۔ میں نے عرض کیا: قبلہ سارا یورپ مسلمانوں کو دہشت گرد کہتا ہے اور اپنی زبان میں وہ ہمارے لیے Terrorist کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ دیکھیئے جب سے جناب رفیق تارڑ صدر بنے ہیں، اس وقت سے سارا یورپ ان کو رفیق Terrer کہتا ہے۔ میری بات سن کر عبدالجبار شاکر بہت محظوظ ہوئے۔ کافی دیر تک ہنستے رہے، مجھے داد دیتے رہے۔ پھر کہنے لگے: تارڑ صاحب سے میری ملاقات چار روز بعد طے ہے۔ میں انھیں یہ لطیفہ ضرور سناؤں گا۔ یہ کہہ کر معاً بولے کہ آپ ہی کا نام لے کر سناؤں گا۔ مجھے ان کی اس بات پر رشک ہوا۔ جو شخص الفاظ کے حوالے سے بھی اتنا محتاط ہو، اس کے ہاں مادی چیزوں کے بارے میں احتیاط کا عالم کیا ہوگا۔

خاموش نہ بیٹھنے والا، گھر کو منتقل نہ کرنے والا، زندگی کی اس روش کو چھوڑ کر منوں مٹی تلے منتقل ہو چکا ہے۔ کاش زمین کی زبان ہوتی تو میں نوشہرہ ورکاں کی مٹی کے ذرّات سے پوچھتا: تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے۔ وہ میرا محبوب تھا، وہ میرا محبّ تھا۔ میرے محبوبوں کا محبّ تھا۔ اب وہ محبت ترک کر کے گریباں سی چکا۔ وہ وہاں چلا گیا جہاں سب کو جانا ہے۔ دنیا والے سفر کریں تو لوٹ کر اپنے گھر ضرور آتے ہیں۔ امیر خسرو نے کہا تھا:

سانجھ پئی چوں دیس

لیکن عبدالجبار شاکر اس سفر پر چلا گیا جہاں سے کوئی مسافر لوٹتا نہیں۔ لیکن ٹھہریئے......

وہ تو یہ سبق دے گیا ہے کہ میں دنیا میں سفر پر آیا تھا۔ اپنے حصہ کا کام کر چکا، اب اپنے گھر لوٹ کر جا رہا ہوں:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

اے نوشہرہ کی خاک! میں تجھ سے مخاطب ہوں اور صرف یہ کہتا ہوں:

اے خاک تیرہ دلبر مارا عزیز دار
ایں نورِ چشم ما است کہ در بر گرفتہ ای

[بہ شکریہ ماہنامہ محدث۔ لاہور]



پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ کے ایام بچپن

عبدالوارث ساجد

پرانی طرز کی بنی ہوئی ایک قدیم حویلی کے صحن میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور اس پر بیٹھے احباب باتوں میں مصروف تھے۔ رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ فیروزی آسمان پر ستارے چمکنے لگے تھے۔ نماز مغرب کے بعد ان احباب کا نماز عشاء تک بیٹھنا روز کا معمول تھا، اس پرانی حویلی کا مالک تو نہ معلوم کون تھا اور کب سے یہ قائم تھی البتہ اس خاندان کا جو پہلا فرد اس حویلی میں آباد ہوا وہ حافظ عبداللہ تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب سید احمد شہید رحمہ اللہ کی تحریک جہاد عروج پر تھی انگریز اور سکھوں کے خلاف جہاد کے نعرے بلند ہوتے تھے۔ ان دنوں حافظ عبداللہ پنڈی بھٹیاں میں رہتے تھے وہاں سے وہ ضلع قصور منتقل ہوگئے۔ قصور آکر وہ اس حویلی میں آباد ہوگئے۔ حافظ عبداللہ خود تو حافظ تھے ہی لیکن کمال یہ بھی تھا کہ ان کی ہونے والی اولاد اور اس کے بعد پھر ان کی اولادیں بھی حافظ قرآن تھیں۔

حافظ عبداللہ سید احمد شہید رحمہ اللہ کی تحریک مجاہدین کے سرگرم کارکن تھے۔ یہ تحریک مجاہدین کے عروج کا زمانہ تھا۔ سید احمد شہید رحمہ اللہ اور ان کے ساتھی مجاہدین کا شہرہ برصغیر پاک وہند میں ہر جگہ تھا۔ لوگ ان سے محبت رکھتے تھے۔ ان کی سوچ اور فکر کو پسند کرتے تھے۔ انگریزوں اور سکھوں کے خلاف ہونے والے جہاد کی وجہ سے ان کے دیدار کے لیے ہر وقت بے چین رہتے تھے۔ یہی حال حافظ عبداللہ کا تھا۔ وہ کٹر حنفی تھے اور حنفیت ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ سید احمد شہید رحمہ اللہ کی ذات سے متاثر ہوکر ان کی زبان سے بتائی ہوئی صحیح اور سچی اسلامی تعلیم سن کر بہت سے لوگوں نے اپنی زندگی کو سنوارا اور سچے اور کھرے اسلام کی پہچان کی۔ ایسے ہی حافظ عبداللہ نے بھی حنفیت کو چھوڑ کر سلفی عقیدہ اپنایا۔ یوں اس خاندان میں وہ پہلے شخص تھے جو صحیح عقیدہ سلفی بنے۔

حافظ عبداللہ کا خاندان پنڈی بھٹیاں سے قصور آکر پلتا اور بڑھتا رہا۔ حافظ عبداللہ کے بعد اس خاندان میں ان کی چشم و چراغ حافظ قطب الدین سربراہ رہے پھر ان کے بیٹے حاجی ولی محمد کا دور آیا پھر حاجی ولی محمد کے بیٹے حاجی قادر بخش کا زمانہ آگیا۔ 1911ء عیسوی کی بات ہے حاجی قادر بخش کے گھر ایک بچے کی ولادت ہوئی جس کا نام عبدالعزیز رکھا گیا۔

عبدالعزیز ابھی کم سن ہی تھا، کہ ایک روز شام کے وقت خاندان کے سارے افراد ایک جگہ جمع تھے۔ حویلی میں محفل خوب گرم تھی کہ اچانک کسی نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ ہم میں سے ہر فرد اپنے اپنے بیٹے کو دین اسلام کے لیے وقف کرے۔ ان دنوں بھلا زمانہ تھا لوگ اچھے، سوچ مثبت اور دینی ہوتی تھی۔ خاندان کے ہر فرد نے تجویز دینے والے کی تعریف کی اور یہ طے پایا کہ ہر فرد اپنا ایک بیٹا اسلام کے لیے وقف کرے گا، مجلس ختم ہوئی۔ حاجی قادر بخش گھر واپس آئے تو آتے ہی انہوں نے اپنے بیٹوں کے ناموں پر قرعہ اندازی کی کہ کس بیٹے کو اسلام کے لیے وقف کیا جائے۔ یوں قرعہ میں عبدالعزیز کا نام نکل آیا۔ حاجی صاحب نے عبدالعزیز کو اسلام کے لیے پیش کردیا۔ حاجی قادر بخش کی طرح ان کے چچازاد بھائیوں نے بھی اپنی اولاد میں سے ایک ایک بیٹے کو اللہ کی راہ میں وقف کردیا۔

اگرچہ اس زمانے میں سکول بھی ہوتے تھے اور بچوں کو دنیاوی تعلیم دلانے کا رجحان بھی تھا لیکن چونکہ وقف ہونے والے یہ بچے اسلام اور اس

کے احیاء کے لیے اللہ کے ہاں پیش کیے گئے تھے اس لیے انہیں دینی تعلیم کے لیے مدرسہ داخل کروا دیا۔ ان دنوں قصور شہر میں مدرسہ ''فریدیہ'' کا بڑا نام تھا۔ لوگ دور دور سے اپنے بچے ہاں پڑھانے کے لیے داخل کرواتے تھے جو دن رات قرآن وحدیث کی تعلیم سے اپنے دلوں کو منور کر کے لوگوں کی اصلاح کرتے تھے۔ جب اسلام کے لیے وقف کیے گئے عبدالعزیز کو مدرسہ فریدیہ داخل کروایا گیا تو اس کی عمر لگ بھگ پندرہ سولہ سال تھی وہ سکول میں آٹھ کلاس پڑھ چکے تھے اور اب ''وقف اللہ'' ہونے کی وجہ سے دنیاوی تعلیم کی بجائے دینی تعلیم حاصل کرنے لگے تھے۔ عبدالعزیز جامعہ فریدیہ کے بعد ''لکھوکے'' میں قائم مرکز اسلام میں مولانا عطاء اللہ لکھوی کے پاس زیر تعلیم رہے۔ حافظ عطاء اللہ لکھوی اس زمانے میں ''صرف ونحو'' کے بہت بڑے ماہر تھے، یوں عربی قواعد وضوابط میں عبدالعزیز نے ان سے عروج حاصل کیا۔

اسلام کے نام پر وقف ہونے والے خاندان کے یہ لڑکے جو آپس میں چچا زاد بھائی تھے اور ان دنوں مختلف دینی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے جب کبھی مل بیٹھتے تو اسلام اور اس کے احکامات پر خوب بحث ومباحثہ کرتے۔ مدرسے سے واپس آ کر کبھی گھر اکٹھے ہوتے تو ان کی مجلسیں خوب رنگ جماتیں۔ مدرسے کے اساتذہ کے احوال اور ان کی باتیں وہاں پڑھائی جانے والی نصابی کتب اور گزرنے والے دنوں پر خوب باتیں ہوتیں۔

ایک روز شام کے وقت ''وقف للہ'' یہ لڑکے اپنے گھر کے آنگن میں بیٹھے باتوں میں مصروف تھے کہ کسی نے اچانک تجویز پیش کی کہ کیوں نہ ہم سب اکٹھے ہو کر دہلی جائیں اور وہاں تعلیم حاصل کریں۔

مشورہ دینے والا لڑکا عبدالرحیم تھا، چچا زاد بھائیوں نے بیک وقت عبدالرحیم کو دیکھا اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ تجویز اچھی تھی لہٰذا کسی کو بھی اختلاف نہ ہوا اور وہ چاروں راضی ہو گئے۔ دہلی اگرچہ قصور سے دور تو تھا لیکن علم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس زمانے میں دہلی میں بڑے بڑے مدرسے تھے جن میں ہزاروں کی تعداد میں طلباء پڑھتے تھے اور اپنے دور کے نامور شیوخ اور علماء ان مدرسوں میں پڑھاتے تھے۔ یوں چاروں چچا زاد بھائی قصور سے چلے اور دہلی جا پہنچے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ دہلی میں کس مدرسے میں داخلہ لیا جائے، دہلی میں قائم تمام مدارس ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ لہٰذا جب فیصلہ کرنے میں دشواری ہوئی تو یہ طے پایا کہ ایک ہی مدرسے میں داخل ہونے کی بجائے ہر کوئی الگ الگ مدرسے میں داخل ہو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ایک استاد کی بجائے کئی استاد ملیں گے اور پھر ہم سب مل کر ایک دوسروں سے دور کر لیا کریں گے۔ یوں وہ چاروں چچا زاد بھائی دہلی میں مختلف مدارس میں داخل ہو گئے۔

اپنے چچا زاد بھائیوں کی طرح عبدالعزیز نے بھی دہلی میں ہی درس نظامی کا کورس مکمل کیا۔ دوران تعلیم ہی اسے ''طب'' سے لگاؤ ہو گیا اور اس نے ''طب'' کا بھی علم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ یوں جب وہ دہلی سے فارغ ہو کر قصور واپس آئے تو ایک عالم کے ساتھ ساتھ اچھے طبیب بھی تھے۔

عبدالعزیز گھر واپس آئے تو ان کی عمر اکیس سال ہو چکی تھی آتے ہی ان کی شادی کر دی گئی۔

قصور کے پاس ایک قصبہ ''کھڈیاں'' ہے جہاں حکیم عبدالعزیز نے قرآن وسنت کی تعلیم دینا شروع کی، جہاں وہ چودہ سال تک تبلیغ دین میں مصروف رہے۔ کھڈیاں اب شہر کا روپ دھار چکا ہے وہاں زندگی کی چہل پہل ہے، اس وقت یہ شہر ایک قصبے کی مانند تھا ان دنوں کھڈیاں کی جامع مسجد جواب محکمہ اوقاف کی زیر نگرانی ہے وہ مولانا عبدالعزیز نے اپنے ہاتھوں سے بنوائی اور بڑی لگن سے اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔

مولانا عبدالعزیز عالم ہونے کے ساتھ اچھے طبیب، بہترین خطیب اور خوش نویس بھی تھے۔ وہ خطاب کرنے بیٹھتے تو چار چار گھنٹے تک بولتے

چلے جاتے۔ایک دفعہ انھوں نے نماز عشاء کے بعد تقریر شروع کی اور صبح کی اذانوں پر جا ختم کی اور لکھتے تو آدمی ان کی خوش نویسی کی تعریف کیے بغیر نہ رہتا۔اسی طرح شاعری بھی بڑی کمال کی کرتے تھے۔پنجابی میں انھوں نے کئی نظمیں لکھیں اور نظم کی صورت میں سفر نامہ حج بھی لکھا۔

یکم جنوری ۱۹۴۷ء کی بات ہے ان دنوں تحریک پاکستان اپنے عروج پر تھی۔اسی روز مولانا عبدالعزیز کے ہاں ایک بچے کی ولادت ہوئی۔حکیم عبدالعزیز کا سب سے بڑا اور پہلا بیٹا تھا۔حکیم عبدالعزیز کو سب سے زیادہ خوشی تھی ایسے ہی پورے گھرانے کو بھی تھی لیکن ان سب سے زیادہ خوش حاجی قادر بخش تھا۔پوتے کی پیدائش کی خبر جب سے اس نے سنی تھی مارے خوشی کے اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

حاجی قادر بخش کو مولانا عبدالجبار غزنوی سے بہت محبت تھی وہ انھیں دل و جان سے چاہتے تھے۔لہٰذا جب گھر میں پوتے کا نام رکھنے کی بات چلی تو انھوں نے مولانا عبدالجبار غزنوی سے محبت کے پیش نظر اپنے پوتے کا نام ''عبدالجبار'' رکھ دیا۔

عبدالجبار ذرا بڑا ہوا تو اسے پہلا سبق ہی لا الٰہ الا اللہ پڑھایا گیا۔خاندان علمی تھا اور گھر میں علم و ادب کا بسیرا تھا۔یوں عبدالجبار نے آنکھ ہی علم کے مرکز میں کھولی تھی۔

پیدا ہونے والے بچے نے یونہی توتلی زبان میں بولنا شروع کیا تو اسے ''یسرنا القرآن'' دیدیا گیا۔اس زمانے میں مولانا عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ بہت بڑے عالم دین تھے۔عبدالجبار نے ''یسرنا القرآن'' سے پہلا سبق ان سے پڑھا۔''یسرنا القرآن'' سے پھر قرآنِ مجید اور پھر یوں یوں روانی ہوتی گئی وہ عمر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔

گاؤں کی فضا تو پہلے ہی دینی رنگ میں ڈھلی ہوئی تھی۔اگرچہ وہاں سینکڑوں خاندان بستے تھے لیکن خلاف شرع کوئی کام نہ ہوتا تھا۔خوشی کے موقعوں پر بالخصوص شادی بیاہ کے اوقات پر بھی کوئی ایسا کام نہ ہوتا تھا کہ جس میں اسلام کے احکامات کی مخالفت ہو،شادی کی رسومات پر ''سہرابندی'' اور اس طرح کی دیگر رسمیں کبھی نہ کسی نے کی تھیں اور نہ سنی تھیں۔یہی حال غمی پر تھا اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں پورے گاؤں کے قبرستان میں ایک بھی قبر پکی نہ ہوتی تھی۔قبر کا پکا ہونا تو کجا لوگ اس پر پختہ اینٹ بھی نہیں رکھتے تھے۔

عبدالجبار نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں ہی حاصل کی۔پہلی دو کلاسیں وہ اپنے والدین سے پڑھ چکا تھا اور جب سکول گیا تو پہلی کی بجائے تیسری کلاس میں داخل ہو گیا۔ذہین اور فطین تو تھے ہی پھر اللہ نے حافظہ بھی خوب دیا تھا جو والدین کی تعلیم و تربیت سے اور بھی بڑھ گیا اور عبدالجبار نے بچپن سے ہی ''کرشمے'' دکھانے شروع کر دیے۔

عبدالجبار کی عمر ابھی چار سال کی تھی کہ اس پر گاؤں کے ماحول اور گھر میں ہونے والی دینی تربیت نے رنگ دکھانا شروع کر دیا۔عبدالجبار گھر میں امی کے پاس رہنے کی بجائے مسجد میں چلا جاتا،جہاں کئی کئی گھنٹے گزار دیتا۔ایک روز سردی کے موسم میں عجیب واقعہ ہوا۔عبدالجبار گھر سے کافی دیر سے غائب تھا۔ماں کو پریشانی ہوئی تو پتا کیا کہ عبدالجبار کہاں ہے؟ لیکن باوجود تلاش کے بھی عبدالجبار نہ ملا۔تلاش کرتے کرتے مسجد میں گئے تو عبدالجبار اپنے اوپر صف لپیٹے مسجد میں پڑا تھا۔مسجد میں اس کے بڑے عجیب عجیب مشاغل تھے۔عبدالجبار کے والد حکیم عبدالعزیز کی تحریک مجاہدین سے قلبی وابستگی تھی۔جہاد سے محبت تھی کہ انھوں نے جہاد کے ہتھیار گھر میں رکھے ہوئے تھے جن میں ایک تلوار بھی شامل تھی۔عبدالجبار وہ تلوار تھام کر مسجد میں چلا جاتا،تلوار تھامے منبر پر چڑھتا اور تلوار کو اپنے ساتھ کھڑا کر لیتا۔تلوار اس کے قد سے بھی بلند ہوتی تھی۔وہ کچھ دیر تک والد صاحب کی طرح خطبہ پڑھتا اور پھر تقریر شروع کر دیتا۔تقریر اسے آتی نہ تھی۔نہ ابھی یہ سمجھ تھی کہ تقریر میں کیا کہا جاتا ہے۔بس انداز دیکھا تھا اور وہی انداز اپناتے ہوئے وہ منبر پر کھڑا ہو جاتا اور اپنے والد کی نقل اتارتا رہتا۔

گاؤں میں بکریاں اور بھینسیں تو عام ہوتی ہیں۔عبدالجبار پانچ سال کا تھا کہ اسے بکری پالنے کا شوق ہوگیا،بھینسیں تو گھر میں موجود تھیں......نہ تھی تو صرف بکری۔ایک روز حکیم عبدالعزیز صاحب گھر آئے تو عبدالجبار نے بکری کی فرمائش کردی۔اگلے دن ہی عبدالجبار کے لیے ایک خوب صورت بکری حویلی میں آ گئی اب عبدالجبار کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔وہ بکری کو شوق سے چراتا،اس کی دیکھ بھال کرتا،یوں جب کچھ مہینوں بعد بکری نے بچے پیدا کیے،تو ننھے منے اٹھکیلیاں کرتے بچے دیکھ کر عبدالجبار خوشی سے لوٹ پوٹ ہوجاتا۔وہ بکری کے بچوں کو اٹھاتا،انھیں گود میں بٹھاتا اوران سے پیار کرتا رہتا۔حویلی میں چوں کہ بھینسیں بھی تھیں لیکن اسے صرف بکری سے انس تھا۔ہاں!ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بیٹھے بٹھائے نہ جانے اسے کیا سوجھی......اس نے حویلی کی ایک طاقت ور مگر شریف طبیعت کی ایک بھینس کا انتخاب کیا اور اپنی چھوٹی چارپائی اس کے اوپر چڑھادی اور بھینس پر چڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔گھر کی سواری تھی اور طریقہ انوکھا۔جب تک جی نہ بھرا خوب سواری کی۔البتہ یہ ہوا کہ نہ صرف حویلی میں بلکہ گاؤں بھر میں اس انوکھی سواری کا تذکرہ پھیل گیا۔

یوں زندگی کی گاڑی کا پہیہ چلتا رہا اور عبدالجبار وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا۔پھر جوں جوں بڑا ہوتا گیا توں توں اس کا شعور بھی بڑھتا چلا گیا۔والدین تعلیم یافتہ تھے،عبدالجبار کے دادا حاجی قادر بخش کو بھی مطالعہ کا بہت شوق تھا اور اس شوق کی تکمیل کے لیے انھوں نے بہت سی کتب جمع کر رکھی تھیں۔

عبدالجبار کبھی کبھار دادا کے کمرہ میں جاتا تو انھیں مطالعہ میں مگن پاتا۔دادا ابو کے پاس چھوٹی بڑی کتابیں پڑی ہوتی تھیں ان کے مضمون کے درمیان نشانی لگی ہوتی اور نوٹ لکھے ہوتے تھے۔وہ عجب نظروں سے کبھی اپنے دادا اور پھر کتابوں کو دیکھتا رہتا تھا۔شام کو جب دادا کے پاس گاؤں کے بڑے بڑے لوگ آتے اور مختلف موضوعات پر بحث مباحثہ ہوتا تو وہ اپنے ننھے ذہن سے سوچتا کہ ''جو لوگ کتابیں پڑھتے ہیں وہ لوگوں کی نظروں میں معزز ہوتے ہیں''اور لوگ ان کی عزت کرتے ہیں اور ان کے پاس بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔

پھر یہی حال ان کے ابو کا تھا سو اس سوچ نے اسے بھی کتابوں سے محبت کرنے پر مجبور کردیا۔وہ دادا ابو کے کمرہ میں آتا یا پھر ابو کے مطب پر جاتا تو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے کتابیں اٹھاتا۔ان پر جمی ہوئی گرد وغبار اتارتا۔کپڑے سے صاف کرتا اور ان کو ترتیب سے رکھتا۔بالخصوص چھوٹی چھوٹی کتابیں اس کی خاص پسند تھیں وہ ان کو جمع کرتا اور پھر بڑی کے پیچھے چھوٹی کی قطار لگاتا چلا جاتا۔جب حکیم عبدالعزیز دہلی سے پڑھ کر واپس آئے تو حاجی قادر بخش کے اس چھوٹے سے کتب خانے میں مزید اضافہ ہوگیا۔

دادا،باپ اور ماں کو کتب پڑھتے دیکھتا تو عبدالجبار کو شوق پیدا ہوا۔لہٰذا اس نے بچپن میں ہی مطالعہ شروع کردیا۔اس زمانے میں ''احوالِ الآخرت''،''عمدۃ الاحکام''اور مولانا عبدالستار کی شاعری کی بڑی کتب مشہور تھیں۔وہ اور اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی کتابیں اس کے زیر مطالعہ رہنے لگی تھیں۔یوں عبدالجبار کے بچپن میں مطالعہ اسلامی ماحول بہت کارگر ثابت ہوا اور عبدالجبار بچپن میں ہی مسجد اور اسلام کا ہوگیا۔اس پر دین کا رنگ چڑھ گیا۔حکیم عبدالعزیز نے عبدالجبار کو ان دنوں میں ہی ترجمہ قرآن پڑھانا شروع کردیا۔ساتھ ساتھ وہ ''صرف ونحو'' کے قواعد پڑھاتے۔باپ کی طرح ماں بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔عبدالجبار بچپن میں ہی والدہ سے ''فارسی'' پڑھتا رہا۔یوں جیسے جیسے بچپن میں اسے اردو سے لگاؤ تھا ایسے ہی فارسی ادب سے دلچسپی تھی۔فارسی کے مشہور مصنف شیخ سعدی کی مشہور ومعروف کتب ''گلستان''،''بوستان'' اور ہندنامہ'' انھوں نے بچپن سے ہی پڑھنا شروع کردی تھیں۔والدہ نے اس کی تربیت اور اسلامی ماحول میں ڈھلنے اور اچھی سوچ وفکر پیدا کرنے میں بہت تگ ودو کی۔مطالعہ کا شوق گویا کہ عبدالجبار کو وراثت میں ہی مل گیا۔

عبدالجبار تیسری کلاس میں تھا کہ جب سے اس نے اپنے ابو سے کتابوں کی فرمائش شروع کر دی۔ عام بچے بچپن میں ان ایام میں والدین سے کھانے پینے کی اشیاء لانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ لیکن عبدالجبار اپنے ابو سے اپنی من پسند کتب کی فرمائش کیا کرتا تھا یوں جب اس کی منگوائی ہوئی کتب گھر آنا شروع ہوئیں تو گویا کہ وہ دادا اور ابو کے کتب خانے کا ''پارٹنر'' بن گیا۔ عبدالجبار نے تیسری کلاس سے مطالعہ شروع کیا تو مڈل پاس کرنے تک وہ سینکڑوں کتابیں پڑھ چکا تھا۔ یوں تو وہ آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا لیکن اپنے حافظے اور علم کے لحاظ سے وہ کسی کالج کا طالب علم لگتا تھا۔ فارسی کتب کا مطالعہ وہ کسی دقت کے بغیر کر لیا کرتا تھا بلکہ فارسی بول چال میں اسے کمال مہارت حاصل ہو گئی تھی۔

عبدالجبار کے دادا اور اس کے ابو شاعری بھی کرتے تھے۔ دیکھا دیکھی یہ شوق عبدالجبار کو بھی ہوا تو اس نے شاعروں کی طرح اپنے نام کے ساتھ بھی ''شاکر'' تخلص رکھ لیا۔ جس بچے کا نام حاجی قادر بخش نے عبدالجبار رکھا تھا وہ اب عبدالجبار شاکر ہو گیا۔ عبدالجبار شاکر کے مطالعہ کے شوق کا یہ عالم تھا کہ راتوں کو اکثر آدھی آدھی رات تک مطالعہ جاری رہتا۔ سکول کے زمانے میں استاد نے لڑکوں کی ٹولیاں بنا رکھی تھیں جن میں ایک لڑکا سینئر (مسئول) ہوتا تھا۔ اس ٹولی میں شامل لڑکوں کو پڑھاتا تھا۔ کلاس کی ایک ٹولی کا نگران عبدالجبار بھی تھا۔ یوں عبدالجبار اپنے ساتھیوں کے ساتھ پڑھنے بیٹھتا تو پھر کئی کئی گھنٹے گزر جاتے لیکن دل تھا کہ بھرنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اس کا عام معمول یہی تھا کہ ایک دن میں پانچ سو صفحے ضرور پڑھنے ہیں۔

اس زمانے میں نہ ہی تو کوئی گھڑی تھی اور نہ ہی بجلی کا نام ونشان۔ لیکن وہ پھر بھی کسی نہ کسی طرح دونوں کا کام بھی لے لیتا تھا۔ اوّل تو اس زمانے میں نظر بہت تیز ہوا کرتی تھی۔ خود عبدالجبار شاکر کا یہ حال تھا کہ چاند کی روشنی میں موٹی لکھائی والی کتاب آسانی سے پڑھ لیتا تھا۔ یہی حال باقی دوستوں کا تھا تاہم پھر بھی وہ رات کو دیے کی روشنی میں کئی کئی گھنٹے پڑھتا رہتا اور جب آدھی رات سے اوپر کا وقت ہوتا تو گھر جانے کی تیاری شروع ہو جاتی۔ وقت معلوم کرنے کے لیے گھڑی کا کام وہ ستاروں سے لیتا تھا اسے معلوم تھا کہ کون سا ستارہ کہاں پہنچ جائے تو کتنا ٹائم ہوتا ہے گویا کہ ستارہ جب اس جگہ پر پہنچ جاتا تو اس کی چھٹی کا ٹائم ہو جاتا اور وہ گھر واپس چلا آتا۔

۱۹۶۰ء کی بات ہے، عبدالجبار مڈل کر کے فارغ ہوا تو اس نے اپنے ہم کلاس اور چند محلے کے دوستوں کے ساتھ مل کر دعوت دین کا کام کرنے کے لیے ایک تنظیم بنائی۔ دوستوں کی تعداد کوئی پانچ کے قریب ہوگی۔ جماعت کا نام انھوں نے ''اصلاحی جماعت'' رکھا۔ اصلاحی جماعت میں جو لڑکے شامل تھے ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ گاؤں کے بازاروں کا چکر لگاتے۔ دکانداروں کے پاس جاتے اور انھیں اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرتے۔ نماز پڑھنے کی تلقین کرتے۔ ''اصلاحی جماعت'' اگرچہ چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی جماعت تھی لیکن اس کے مقاصد بہت بڑے تھے۔ اصلاحی جماعت کا کام آہستہ آہستہ بڑھنے لگا تھا۔ پہلے پہل لڑکوں نے اپنے گاؤں کو ذریعہ تبلیغ بنایا۔ پھر گاؤں سے باہر کھیتوں میں کاشتکاروں کے ڈیروں پر چلے جاتے اور کسانوں میں تبلیغ کرتے۔ اپنے گاؤں کے بعد وہ آس پاس کے گاؤں، ان کے بازاروں اور منڈیوں میں جا کر تبلیغ کرتے تھے۔ اصلاحی جماعت کے سارے رکن پہلے سکول جاتے اور سکول سے واپس آنے کے بعد اپنے اپنے ذمے لگے گھریلو کام سرانجام دیتے۔ خود عبدالجبار بھی گھر کے کام دلچسپی سے کرتا تھا۔ وہ باپ کے مطب پر بلاناغہ تو جاتا ہی تھا وہاں پر والد صاحب کی کتابوں کو درست کرتا، ادویات کو سنبھالتا، عرق نکالتا، شربت بناتا اور گولیاں تیار کرتا، پھر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے بہت سے نسخے یاد ہو گئے۔ ساتھ وہ بھینسوں کے لیے چارہ بھی تیار کر دیتا۔ گاؤں میں بھینسوں کو ''ونڈ'' ڈالی جاتی ہے، اس کی تیاری میں گندم کا بھوسہ جسے پنجابی میں ''توڑی'' کہا جاتا ہے، اس میں کھل اور دانہ ملا کر بھینس کو کھلایا جاتا ہے تاکہ بھینس نہ صرف طاقتور ہو بلکہ دودھ بھی زیادہ دے۔ عبدالجبار شاکر سکول سے واپس آنے کے بعد یہ کام بھی کرتا اور پھر دوسرے لڑکوں کے ساتھ تبلیغ کے لیے نکل جاتا۔ کام چوں کہ اسلام کی اشاعت کا ذریعہ تھا لہٰذا گھر والوں کی طرف سے بجائے روک ٹوک کے حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس نیک کام کی گھر میں

عزت ہوئی تو باہر سے بھی تکریم ملی۔عبدالجبار اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب تبلیغ کے لیے نکلتا تو کبھی کبھار بڑے عجیب واقعات ہوتے۔وہ کسی دکان پر جاتے اور دکان پر بیٹھے آدمی کو چاچا یا لالہ کہہ کر تبلیغ شروع کرتے تو وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی باتیں سن کر فرط جذبات سے سینہ سے لگا لیتے اور نہ صرف ان کی حوصلہ افزائی کرتے بلکہ انھیں تھپکی دے کر اپنی دکان سے کھانے کی اشیاء فراہم کرتے۔

''اصلاحی جماعت'' کا تبلیغ کے بعد دوسرا بڑا کارنامہ مناظرے کرنا تھا۔عبدالجبار شاکر مناظرین میں پیش پیش تھا۔اصلاحی جماعت کے زیادہ تر مناظرے'' قادیانیوں'' سے ہوتے تھے اور مناظرہ خود عبدالجبار شاکر کیا کرتا تھا۔اس کے لیے اس نے بھر پور تیار کر رکھی ہوتی تھی۔خاص طور پر قادیانیوں کے خلاف لکھی گئی کتب کا مطالعہ کیا جاتا اور قادیانیوں کے ردّ میں لکھی گئی مشہور کتاب ''محمدیہ پاکٹ بک'' سے خاص خاص راز کی باتیں نوٹ کرتا اور خود کو مناظرے کے لیے پہلے سے تیار کر لیتا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ دیکھا دیکھی گاؤں کے چند بڑے آدمیوں نے قادیانیوں کو مناظر یکا چیلنج کر دیا جو قادیانیوں نے بغیر حیل و حجت کے قبول کر لیا۔اب گاؤں والوں کے لیے پریشانی بن گئی کیوں کہ کوئی بڑا عالم دین تو ان کی نظر میں نہ تھا جو مناظرے کے لیے قادیانیوں کے خلاف لایا جاتا۔سو جب کوئی بھی نام سامنے نہ آیا تو کسی نے ''ننھے مناظر'' کا مشورہ دیا۔مشورہ کی تائید ہوئی کہ جب عبدالجبار ہے تو پھر کسی دوسرے کی کیا ضرورت؟ یوں آٹھویں جماعت کے طالب علم عبدالجبار شاکر کو مناظرے کے لیے تیار کر لیا گیا اور گاؤں کے چھوٹے بڑے سبھی مل کر مقررہ دن مناظرے کے لیے چل پڑے۔خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ عبدالجبار شاکر نے مناظرے کا میدان مار لیا۔قادیانی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تو مارے خوشی کے گاؤں والوں نے عبدالجبار شاکر کو کندھوں پر اٹھا لیا۔یوں کندھوں پر سوار نعروں کی گونج میں جب عبدالجبار شاکر گاؤں میں داخل ہوا تو عجب سماں تھا، گاؤں کے سبھی بڑے کم سن عبدالجبار شاکر کو کندھوں پر اٹھائے سیدھے حکیم عبدالعزیز کے پاس گئے انھیں خوش خبری سنائی کہ آج آپ کے بیٹے نے قادیانیوں کو دندان شکن شکست دی ہے اور تمہارا بیٹا کامیاب مناظر کے طور پر لوٹا ہے۔

پھر کیا تھا عبدالجبار کی شہرت کا ڈھنڈورا گاؤں تو کیا آس پاس کے گاؤں میں بھی پیٹا جانے لگا اور اصلاحی جماعت کی سرگرمیوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا نہ صرف عبدالجبار شاکر بلکہ اصلاحی جماعت کے باقی ننھے مبلغین جس طرف بھی جاتے لوگ عزت واحترام کی وجہ سے انھیں آنکھوں پر بٹھاتے۔

اسی دور میں جب کہ عبدالجبار مڈل میں تھا کہ اس نے اپنے والد گرامی سے قرآنِ مجید کا ترجمہ بھی مکمل کر لیا اصلاحی جماعت اور مناظروں میں دلچسپی کی بڑی وجہ عبدالجبار کا مذہبی جلسوں میں شوق سے جانا تھا۔کہیں جلسہ ہوتا وہ اپنے ابو سے کہتا اور یوں حکیم عبدالعزیز بیٹے سمیت جلسے والی جگہ پر جا پہنچتے۔مولانا اسماعیل روپڑی، شیخ القرآن مولانا محمد حسین شیخوپوری رحمہ اللہ کی جوانی کا عالم تھا، ان کی تقریریں دلوں میں اتر جاتی تھیں۔اس لیے جب بھی کہیں قرب وجوار میں ان بزرگوں کا کوئی پروگرام ہوتا تو عبدالجبار خاص طور پر اس میں شرکت کرتا۔

انہی دنوں کی بات ہے جب عبدالجبار شاکر آٹھویں کلاس میں تھا ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔مڈل کا امتحان دے کر وہ فارغ ہوا ہی تھا کہ کٹائی کا موسم شروع ہو گیا۔حکیم عبدالعزیز کے پاس کچھ زمین کاشتکاری کے لیے تھی۔اس فصل کی کٹائی کا وقت آیا تو سب مل جل کر کٹائی کی تیاری کرنے لگے۔عبدالجبار شاکر نے چچاؤں کو زوروشور سے تیاری کرتے دیکھا تو کہا ابو کٹائی کے لیے میں بھی جاؤں گا۔حکیم صاحب نے بیٹے کا شوق دیکھا تو گاؤں کے لوہار کے پاس گئے اور اسے ایک چھوٹی درانتی تیار کرنے کے لیے کہا۔درانتی تیار ہو گئی تو عبدالجبار کو لا کر دی۔بولے بیٹا! لو تم بھی کٹائی میں حصہ لے لینا۔

یوں عبدالجبار بھی خاندان کے سارے افراد کے ساتھ پہلی مرتبہ کٹائی کے لیے گیا۔کھیت کی تقسیم ہوئی اور کٹائی کے لیے حصے مقرر ہو گئے، یوں کٹائی شروع ہوگئی۔صبح سے دوپہر ہوئی تو دھوپ تیز ہوگئی اور سورج کی تپش میں اضافہ ہوگیا پھر کھیت میں کام اور وہ بھی بچپن میں گرمی میں حد سے زیادہ اضافہ ہوگیا۔حکیم عبدالعزیز عبدالجبار کے پاس آئے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔

ماتھے سے پسینہ بہہ رہا تھا۔انھوں نے گرمی کی وجہ سے پسینے سے شرابور بیٹے کو دیکھا تو پھر ایک نظر کھیت کے اس حصے پر ڈالی جہاں عبدالجبار کٹائی کرر ہا تھا ابھی تک عبدالجبار نے صبح سے دو مرلے سے زیادہ جگہ کی کٹائی نہ کی تھی لیکن حکیم صاحب نے عبدالجبار کی پیٹھ تھپکائی اور انھیں خوب داد دی۔

بولے عبدالجبار! مجھے اس سے غرض نہیں کہ تم نے کتنی فصل کتنے ٹائم میں کاٹی ہے، میں تو خوش اس لیے ہوں کہ محنت اسلامی شعائر میں سے ہے اور تم اس میں اتنی محنت سے کام لے رہے ہو۔یہ محنت عبدالجبار کے بچپن کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی وہ۔کھیت سے چارہ لاتا، بھینسوں کو ڈالتا اور حویلی میں آنے والے مہمانوں کی دیکھ بھال کرتا، کئی کاموں میں دلچسپی ہوتی تھی۔حویلی میں کبھی کبھار بہت سے دلچسپ واقعات رونما ہوتے۔عبدالجبار جب کبھی شرارت کے موڈ میں ہوتا، اپنے والد کے کمرے میں جاتا ان کی پگڑی سر پر پہنتا۔ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے میں کتاب تھامتا اور حویلی کے وسط میں چارپائی بچھا کر بیٹھ جاتا پھر اعلان ہوتا کہ حویلی والے سارے جمع ہو جائیں۔یوں عبدالجبار کی والدہ، بہنیں، بھائی، خالائیں اور پھوپھیاں جمع ہوجاتیں اور وہ چھوٹا ''شیخ الاسلام'' بن کر ان کو وعظ شروع کر دیتا۔بچپن میں کہنا کہلانا کیا تھا عبدالجبار اپنے ابو کی نقل اتارتا تو سب ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوجاتے۔تب خالائیں اور پھوپھیاں اسے انعام سے نوازتیں اور اسے ایک یا دو آنے انعام کے طور پر دیئے جاتے۔اس دور میں ایک آنے کی بھی بڑی وقعت تھی ایک آنے سے ایک انڈا آسانی سے خریدا جاسکتا تھا لیکن عبدالجبار ان پیسوں کو بھی نہ خرچ کرتا بلکہ ایک ایک آنہ جمع کرتا رہتا اور جب کئی روپے اکٹھے ہوجاتے تو ان کی کتب خرید لیتا۔

عبدالجبار کو یوں شرارت کا یہ فائدہ تو ہوتا ہی تھا کہ پیسے اکٹھے ہوجاتے لیکن گھر سے باہر سکول میں اس کا بہت بڑا فائدہ ہوا۔ہوا یوں کہ مڈل میں دورانِ تعلیم ہی ایک مرتبہ صدر ایوب قصور کے دورے پر آنے والے تھے اور وہ قصور میں کوئی مثالی گاؤں دیکھنے کی خواہش رکھتے تھے۔قصور ان دنوں ضلع لاہور میں شامل تھا اور قصور کے ساتھ ایک گاؤں ''جاگووالا'' کے نام سے تھا۔صدر ایوب کو مثالی گاؤں کے طور پر اس گاؤں کو دکھانے کا فیصلہ ہوا۔صدر ایوب نے اس گاؤں کے مڈل سکول میں بھی جانا تھا اور مسئلہ یہ تھا کہ اس سکول میں کوئی ایسا ہونہار طالب علم نہ تھا جو صدر ایوب سے ہاتھ ملاتا اور اس کے پوچھے ہوئے سوالات کے جواب دیتا۔

بالآخر ''جاگووالا'' سکول کے اساتذہ عبدالجبار کے گاؤں آئے اور وہاں سے کچھ لڑکوں کا انتخاب کر کے لے گئے کہ وہ صدر ایوب کی سکول آمد پر پی ٹی شو کریں گے۔لیکن مسئلہ پھر بھی یہ تھا کہ صدر ایوب سے کون سا بچہ ہاتھ ملائے گا۔سوچ بچار کے بعد بالآخر یہی فیصلہ ہوا کہ اس لائق صرف ایک ہی لڑکا ہے اور وہ ہے حکیم عبدالعزیز کا بیٹا عبدالجبار شاکر۔طے شدہ پروگرام کے تحت صدر ایوب اس گاؤں آئے اور عبدالجبار شاکر نے نہ صرف اس سے مصافحہ کیا بلکہ اس کے پوچھے ہوئے سوالوں کا ترکی بہ ترکی جواب بھی دیا۔اسکے بعد ایسا سلسلہ چلا کہ میٹرک تک رہا۔سکول میں جب بھی کوئی انسپکٹر آتا اور بچوں کو تقریر کے لیے پیش کیا جاتا تو ان میں عبدالجبار سرفہرست ہوتا۔

گھر میں مولانا عبدالعزیز صاحب بیٹے کو پڑھاتے۔جب ۱۹۶۰ء کا زمانہ آیا تب تک عبدالجبار مڈل کر چکا تھا۔دو سال بعد میٹرک کیا اور میٹرک کے بعد کالج میں داخل ہو گئے۔

کالج کی تعلیم کے لیے انھیں قصور سے ساہیوال جانا پڑا جہاں وہ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں چار سال تک پڑھتے رہے۔کالج سے فارغ ہونے

کے بعد پنجاب یونیورسٹی داخل ہوگئے جہاں دو سال کے عرصہ کے بعد ایم اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ یہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے جب وہ یونیورسٹی سے فارغ ہوگئے تو میونسپل کالج چنوکی میں لیکچرار مقرر ہوگئے۔ تب سے اب تک کا سفر لگ بھگ ۳۵ سال کا ہے اور وہ پنجاب کے مختلف تعلیمی اداروں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

۱۹۸۲ء کی بات ہے وہ گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں پروفیسر تھے کہ اس زمانے میں حکومت پاکستان نے ایک نیا محکمہ بنایا جس میں پبلک لائبریریز کا ایک ڈائریکٹر بنانا تھا اور اس کے لیے ایسے آدمی کی تلاش تھی جو کتابوں سے جنون کی حد تک ذہنی مناسبت رکھتا ہو اور عبدالجبار شاکر ان دنوں کتابوں سے حوالے سے بہت مشہور ہو چکے تھے۔ کتابوں سے ان کی محبت کے متعلق بہت سے لوگوں کو علم تھا۔ یوں ڈائریکٹر کے لیے جس شخص کا انتخاب ہوا وہ حکیم عبدالعزیز کا وہ بیٹا تھا جو بچپن میں قصور میں پلا بڑھا اور پھر کتابوں سے محبت ہی کی وجہ سے پنجاب پبلک لائبریریز کا پہلا ڈائریکٹر بنا۔ بعدازاں وہ اسلام آباد میں واقع الدعوۃ یونیورسٹی کے ڈائریکٹر اور فیصل مسجد کے خطیب بنا دیئے گئے۔ ۱۴/اکتوبر کی صبح اس عظیم اسکالر کی وفات ہوگئی جنھیں شیخوپورہ میں دفن کر دیا گیا۔ [بہ شکریہ روضۃ الاطفال۔ لاہور]



معروف ماہر تعلیم ومذہبی اسکالر

پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ

اپنے افکار اور خیالات کے آئینے میں

پروفیسر رانا تنویر قاسم

پروفیسر عبدالجبار شاکر ایک مہکتے ہوئے پھول کا نام تھا جو ہر دم چمنستان دہر میں اپنی خوشبو بکھیرتا رہا۔ وہ قائداعظم اور علامہ اقبال کے افکار کے امین تھے۔ پاکستان کی فکری وثقافتی شناخت کا مسئلہ ہو یا عالم اسلام کے خلاف ہنود ویہود اور صلیبی یلغار کی فضا ہو وہ اپنی علمی بصیرت سے ان کا حل اور تدابیر بڑے خوب صورت طریقے سے بیان کرتے۔ وہ ۱۳۔ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو داعی اجل کو لبیک کہہ گئے اور اپنے پیچھے حسین یادیں چھوڑ گئے۔ ان کے مداحین کی تعداد لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ضرور ہے۔

۶۲ سال کی زندگی میں ان کے پچاس سال تعلیم وتعلّم، درس وتدریس اور کتابوں کے پڑھنے اور ان کے سمجھنے کے عمل میں صرف ہوئے۔ وہ اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ انھوں نے ایسے گھر میں آنکھ کھولی، کتاب وعلم کا ذوق جس کی زینت تھا۔ ادبی وتعلیمی فضا اور سلفی تعلیم وتربیت انھیں اپنے خانوادہ سے ملی اور عہد طفولیت میں ہی ایمان، اسلام، علمی وادبی محافل میں شرکت کا بھرپور موقع نصیب ہوا۔ یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو میر محمد ضلع قصور میں حکیم عبدالعزیز رحمہ اللہ کے گھر پیدا ہونے والے اس رجل عظیم کا نام مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کی نسبت اور تعلق سے عبدالجبار رکھا گیا۔ ابتدائی تعلیم شام کوٹ، حسین خان والا چونیاں، میں حاصل کی۔ بعد ازاں میٹرک اور ایف۔اے پتوکی جب کہ بی اے گورنمنٹ کالج ساہیوال سے کیا۔ ۱۹۶۸ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔اے اردو کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ تدریسی زندگی کا آغاز بطور لیکچرر گورنمنٹ کالج پتوکی سے ۱۹۶۹ء میں کیا۔ ۱۹۷۱ء میں لیاقت پور ضلع رحیم یار خان اور ۱۹۷۶ء میں گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں تدریسی فرائض انجام دیئے۔ اسی دوران قانون کی تعلیم کے سلسلے میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور کالج کی تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ فارغ اوقات میں درس نظامی کی تعلیم مکمل کی۔ دینی تعلیم سے فراغت کے بعد جامع مسجد محمدیہ پرانا لاری اڈہ شیخوپورہ میں خطبہ جمعہ کی سعادت ان کے حصے میں آئی اور پھر اپنی دانشورانہ صلاحیتوں اور زبان وادب پر مہارت کی بنیاد پر ترقی کا یہ سفر ڈائریکٹر جنرل پنجاب لائبریریز سے الدعوۃ اکیڈمی کے ڈائریکٹر اور فیصل مسجد کی خطابت تک جاری رہا۔ تحریر وتقریر میں انھیں کمال کا ملکہ حاصل تھا۔ وہ بولتے تو الفاظ کے موتی ادب کی چاشنی سے لبریز دکھائی دیتے۔

ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو
ان کے لہجہ میں ادب کے تیور

ان کی برجستہ اور فی البدیہہ گفتگو ہر ایک کو ان کا گرویدہ بنا دیتی تھی۔ ان کے لفظوں میں ایک معجزاتی تاثیر پائی جاتی تھی۔ زبان سے ادا کیا ہوا ان

کا ہر لفظ باطن کا مظہر اور عکاس ہوتا تھا۔ ذخیرہ الفاظ کے استعمال پر مکمل عبور حاصل تھا۔ ہر لفظ کے پیچھے ان کی شخصیت، تجربات ومخصوصات، اقدار ونظریات کا ایک بحر بے کراں ہوتا تھا۔ ان کا لباس پہننے کا اسلوب بڑا سادہ اور شائستگی سے آراستہ ہوتا تھا۔ ان کا انداز گفتگو، اٹھنے بیٹھنے کے قاعدے اور ان کا ذوق مطالعہ، طلبہ اور ہر علم دوست کے دل پر آج بھی نقش ہے۔ ان کے ساتھ علمی بیٹھک اور صحبتیں مجھے متعدد بار میسر آئیں۔ ان کی وفات سے قبل راقم کو اپنے (پی ایچ ڈی) مقالے کے سلسلے میں ''بیت الحکمت'' میں ان سے پاکستان اور عالم اسلام کے مسائل پر تفصیلی انٹرویو کرنے کا موقع ملا، جس میں انھوں نے بڑی پرمغز باتیں کیں جن سے ان کے فکر وفلسفہ اور خیالات کو جانا جاسکتا ہے۔ ذیل میں انٹرویو کے کچھ اقتباسات پیش خدمت ہیں جو اپنے اندر بہت سارے پیغامات لیے ہوئے ہیں۔ عالم اسلام کو درپیش چیلنج کے تناظر میں انھوں نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ

''مغلوبیت سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنا وقت کی ضرورت ہے تاہم اس سے زیادہ ان محرکات کا پتا چلانا ضروری ہے جن کے باعث عالم اسلام مسائل کا شکار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملت اسلامیہ ایک عقیدے اور تمدن کا نام ہے اور وہ عقیدہ ثقافتی مظاہر چاہتا ہے جو تمدنی عضاء میں ڈھلنا چاہتا ہے جو معاشرتی وریاستی تعمیر اپنے اندر چاہتا ہے اور جو ملت کی کردار سازی چاہتا ہے۔ یہ وہ خصائص ہیں جو ملت اسلامیہ کی انفرادیت کے حامل ہیں۔ اس طریقے سے ہر وہ فرد جو اسلام کے عقیدے سے وابستہ ہے وہ دراصل ملت اسلامیہ کی ایک اکائی ہے اور یہ اکائیاں اگر کہیں وحدت کی شکل میں موجود ہیں تو وہ ایک ملک بن گیا ہے اور کہیں یہ اکائیاں اتنی تھوڑی تعداد میں ہیں کہ وہ غیر مسلموں کے ہاں اقلیتوں کی صورت میں موجود ہیں۔ لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت دنیا کی چھ ارب آبادی میں سے ہر چوتھا شخص مسلمان ہے۔ ملت اسلامیہ کا یہ اعزاز ذرا ایک اور پہلو سے دیکھئے کہ دنیا میں آج ملت اسلامیہ کے علاوہ جتنی اقوام وملل ہیں ان کے ساتھ ملت اسلامیہ کا تعلق تصادم یا تخالف یا معرکہ آرائی کا نہیں ہے اور نہ ہی حسد یا حریف ہونے کا ہے۔

امت مسلمہ کی حیثیت سے اگر ہم مخلص اور سچے ہیں تو ہمیں دعوت کا کام کرنا چاہیے جو بالآخر انسانیت کے مستقبل کی حفاظت کرسکتی ہے۔ اغیار کے ہاں امن وسلامتی کے جذبات پیدا کرسکتی ہے اگر کائنات کے اندر مساوات، اخوت اور محبت کا درس کسی تہذیب میں موجود ہے اور مستقبل کے اندر ان اقداراور روایات کو اپنے ہاں جگہ دے سکتی ہے تو وہ اسلام اور ملت اسلامیہ کے علاوہ کوئی اور قوم نہیں ہے۔ دنیا کے گلوب کو اگر آپ توجہ سے دیکھیں اس میں ایک طرف قطب شمالی ہے اور دوسری طرف قطب جنوبی ہے۔ اس کے بین اور اردگرد پائے جانے والے علاقے زندگی کی بنیادی ضرورت سے خالی ہیں۔ ملت اسلامیہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک کچھ ایسے خط استواء میں موجود ہیں کہ جس میں زندگی کی بڑی بنیادی ضرورتیں ہیں جو کسی تہذیب کے مستقبل کی نشوونما کے جو بنیادی عوامل ہوسکتے ہیں یا کسی تمدن کی پائیداری میں اہم ہوسکتے ہیں وہ سارے کے سارے عالم اسلام کے پاس موجود ہیں۔ ہیومن ریسورسز کو دیکھ لیں مسلمان اپنی صلاحیت کے اعتبار سے دنیا کی کسی بھی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ جہاں تک قدرتی وسائل کا تعلق ہے تو شاید اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو عالم اسلام کے خطوں میں قدرتی وسائل زیادہ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان وسائل کو ایک خام مال کی حیثیت سے ایک ترقی یافتہ ممالک خریدتے ہیں اور امت مسلمہ ان سے وہ کام لینے کی بجائے محض خام مال کے طور پر بیچ دیتی ہے جو ہماری معاشی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہے۔

ان حالات میں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ ملت اسلامیہ کو تین سطحوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک تو ملت اسلامیہ اپنے اندر ایک صالح لیڈر آگے لائے جو ان کے مقاصد واہداف کے مطابق قوم کو آگے لیجانے کی کوشش کرے۔ جو اخلاقی اور روحانی رفعت سے وابستہ ہو جس کا وہ تحفظ کرے۔ مسلمانوں کی ثقافت اور ان جیسا تمدن ان کے پاس موجود ہو اور عالم اسلام کے اندر وہ ایک وحدت کے تصور کے ساتھ آگے آئے۔ اس سے

زیادہ دوسرا پہلو جو ہمارے پاس ہونا چاہیے وہ یہ کہ ملت اسلامیہ اپنے ہاں ایکسپرٹ سینٹر قائم کرے اور میں اس پر اس لیے توجہ دلانا چاہوں گا کہ ان ایکسپرٹ سینٹر سے مراد یہ ہے کہ زندگی کے جتنے سائنسی ادارے ہیں خواہ وہ بائیولوجیکل سائنس یا ذوالوجیکل سائنس سے وابستہ ہوں یا سوشیالوجی سے وابستہ ہوں یا زرعی وسائل کے ساتھ ہو خواہ وہ میڈیکل سائنسز ہیں یا سپیس سائنسز ہیں یا علیٰ ہذاالقیاس کسی بھی شعبے سے وابستہ ہوں ملت اسلامیہ کو سائنس کے جتنے آفاق ہیں ان میں سے ہر ایک افق پر ایک الگ شہر قائم کرنا چاہیے اور اس شہر کے اندر علم کے جتنے چوٹی کے ماہرین ہیں وہ مل بیٹھیں کہ خصوصی علوم کے تمام شعبوں میں ملت اسلامیہ کو دوسری اقوام سے آگے لے جانے کی کوشش کریں۔

ایسے ہی اکانومسٹ کا شہر بسنا چاہیے ڈاکٹرز کا شہر بسنا چاہیے۔انجینئرنگ کے مختلف ڈسپلن کے شہر بسنے چاہیے ہر ہر پہلو پر ایسے ایکسپرٹ سینٹر بنانے کے ساتھ جوہری توانائی پر سٹی بنا چاہیے۔سپیس سائنس پر ایک سٹی بنا چاہیے میں کہتا ہوں کہ ایک دعوت پر بھی ایکسپرٹ سٹی بنا چاہیے کہ ہماری وہ دعوت کے جس کا مزاج ہی آفاقی ہے اس کو ہم کیوں لوکل رکھیں۔دعوت کی خوشبو کو کیوں نہ عالمی سطح پر پھیلائیں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی تہذیب کے اندر وہ پوٹینشل موجود ہے کہ آفاقی تہذیبوں کے جو مقاصد ہو سکتے ہیں یا ان کے جو اہداف ہو سکتے ہیں یا ان کی جو ضرورتیں ہو سکتی ہیں ہر سطح پر یہ تہذیب اس کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

عالم اسلام میں مختلف میدانوں کے ایسے ماہرین موجود ہیں جن کے الگ سے شہر بسائے جائیں جو پورے عالم اسلام کے لیے اس قسم کی پالیسی وضع کریں۔تحقیقات کو اس طریقے سے چینلائز کریں کہ اسلام کے قدرتی وسائل کی مدد سے بہت بڑا اقتصادی،سائنسی،ٹیکنیکلی انقلاب لایا جاسکے اور یہ جو بظاہر مغرب کی برتری نظر آتی ہے وہ صرف ہماری غفلت کی وجہ سے ہے کہ ہم اپنے قدرتی وسائل کو اور ماہرین کو موٹی ویٹ نہیں کر سکے ان سے وہ کام نہیں لے سکے۔عالم اسلام کو ایک فکری اور ثقافتی وحدت کے اندر پرونا چاہیے اگرچہ ناممکن ہے کہ عالم اسلام ایک ہی وحدت میں پورے کا پورا ڈھل جائے لیکن اپنے اپنے جغرافیائی حدود کے اندر کچھ ایسے مشترک مقاصد ہو سکتے ہیں کہ جن کے لیے پورا عالم اسلام ایک دکھائی دے۔

باقی جہاں تک ان کے اپنے اقتصادی معاملات ہیں تو انھیں کم از کم ویزے کی حد تک پاسپورٹ کی حد تک سفارتی آداب ورسوم کی حد تک ایک دوسرے کے قریب ہونا چاہیے۔ہمارے طلبا وریسرچ سکالر کو اہل علم اور اہل ہنر کو اتنے کثرت کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ آنا چاہیے کہ ایک عقیدے کے لوگ ایک سانچے کے اندر ڈھلے ہوئے نظر آئیں۔علاقائی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے بھی عالم اسلام کی وحدت دکھائی دیں۔ان مقاصد کے حصول کے لیے ان سے جب سوال کیا گیا کہ اسلامی دنیا میں کون سے ممالک قائدانہ کردار ادا کر سکتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ چار ممالک رول کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ان میں سے پہلا ملک ملائیشیا دکھائی دیتا ہے وہ مسلم تشخص اور کلچر کے حوالے سے ایک اقتصادی دیو بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ایک دفعہ تو اس نے عالمی اقتصادی دنیا کو کرائسز میں مبتلا کر کے رکھ دیا تھا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم اسلام کے پاس قیادت موجود ہے لیکن ان کو مواقع نہیں ملے۔اس لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ جدید عصری شعور کے حوالے سے ایک بہت بڑی فکری وحدت پیدا کرنے میں ملائیشیا اہم رول ادا کر سکتا ہے۔دوسرا میں سوڈان کو دیکھتا ہوں اگرچہ ان کے حالات وواقعات ہمارے پاس اس طرح نہیں پہنچتے انھیں مسلم عیسائی علاقائی مسئلے میں الجھایا جا رہا ہے۔اگر سوڈان کو اسی طرح سے مزید وقت مل گیا کہ وہ قوم جو افریقہ کے بطن میں پل رہی ہے کہ وہ اسلام کے فکری اور ثقافتی ورثے کی حفاظت کے لیے بڑا کام کر سکتی ہے۔سعودی عرب میرے نزدیک تیسرا ملک ہے جو اگرچہ تمام عالمی سطح پر پڑنے والے دباؤ کے باوجود اس کے ادارے جن میں رابطہ عالم اسلام اور ادارہ تنظیم المساجد اور اس کے علاوہ اور بہت سارے سماجی اور ثقافتی ادارے اسلامی شعور اور خدمات سے اسلامی فکر اور وسائل کو عام کرنے کے لیے، بہت بڑی قربانی دے رہے ہیں اور اس

سے بہتر عالم اسلام میں ویلفیئر ٹرسٹ سٹیٹ کوئی نہیں ہے۔

اس ملک کو بین الاقوامی سطح پر کون کون سی آزمائشوں کا سامنا ہے اس کا ہمیں اندازہ نہیں ہے لیکن عربوں میں ایسی بصیرت بہرصورت موجود ہے کہ انھیں مستقبل میں اپنے آپ کو کیسے ڈھالنا ہے وہاں وسیع تر پارلیمانی اور شورائی مزاج موجود ہے جس کا انھوں نے بڑا اچھا آغاز کیا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ عالمی سطح پر آزمائش اور فتنہ پیدا کرنے کی جو بھی کوشش ہوسکتی ہے اس کا انھیں ادراک ہے۔

ایران بھی ایسی ریاست ہے۔ اسلامی کلچر اور معارف کے فروغ کے لیے ایران کا کردار کسی بھی اسلامی ملک سے کم نہیں ہے۔ وہ ایک ایسا برادر اسلامی ملک ہے جس کو ماضی میں استعماری قوتوں نے بڑی الجھنوں میں پھنسائے رکھا۔ لیکن انھوں نے شاہِ ایران کی معزولی اور انقلاب کے بعد جس راستے کو اختیار کیا ہے اس سے وہ ایک قوم کی حیثیت سے ابھرے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض ممالک جہاں اسلامیت اور سیکولر کے درمیان کشمکش بڑے عروج پر ہے جیسا کہ ترکی، جہاں پر ایک طرف سیکولر مزاج ہے اور ساتھ وہاں پر ایمانی اور روحانی قوت کا حامل طبقہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ بڑی رکاوٹیں ہیں ان کے راستے میں وہاں اسلامی کلچر کا اظہار کرنے پر بھی بڑی پابندیاں ہیں لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ترکی کا معاشرہ احیائے دین کے لیے ایک نئے طریقے سے ابھرے گا۔ ایسے ہی عالم اسلام کے سارے خطوں میں ایسے اشخاص موجود ہیں کہ جن کی موجودگی مستقبل میں اسلام اور سیکولرازم کے درمیان کشمکش میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔

غیر اسلامی ممالک کے اندر مسلم ماہرین کا کردار بھی موجود ہے۔ امریکہ میں کون سا ایسا ادارہ ہے کہ جہاں مسلمان ان کے ساتھ قدم بہ قدم خدمات انجام نہیں دے رہے ہیں۔ بدقسمتی سے مسلم دنیا کی بانجھ سیاسی قیادت کے باعث اور عصری تقاضوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اور ملت اسلامیہ کے ادراک اور احساس نہ رکھنے کی وجہ سے وہ ایک ایسی دفع الوقتی میں مبتلا ہیں کہ بڑی طاقتوں کی ظاہری خوشنودی انھیں مقصود ہے۔ اب ملت اسلامیہ بڑے عرصے کے بعد خواب غفلت سے بیدار ہوئی ہے اس سے مجھے ترقی کا سفر روشن دکھائی دیتا ہے اور ملت اسلامیہ کی نوجوان نسل میں جتنی صلاحیت اور شعور ہے جتنی صدائے احتجاج آج محسوس کرتا ہوں کئی صدیوں کے اندر مجھے ایسی فضا نظر نہیں آئی دنیا کی کوئی قوت ملت اسلامیہ کے نوجوانوں کے فکر انقلاب کا راستہ نہیں روک سکتی۔ انھوں نے کہا کہ مذہب کے اندر سلامتی پائی جاتی ہے۔ ہم تو سلامتی کے تصور کے حامل ہیں اور یہ ہماری ایمانی ذمہ داری ہے کہ دنیا کے امن کو قائم رکھنے کا فریضہ انجام دیا جائے۔

مسلمانوں نے نظام خلافت کو جہاں کہیں بھی متعارف کرایا۔ اس کے نتیجے میں بدامنی ختم ہوئی ہمارے بنیادی داعیہ میں امن کی خوشبو آتی ہے یہ بڑی ہی بدنصیبی کی بات ہے کہ مسلمان امت کو ایک طرف دیوار سے لگایا جاتا ہے۔ ان کے حقوق کو اجتماعی طور پر پامال کیا جارہا ہے۔ انھیں اپنی سرزمین کے اندر اجنبی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ پھر اس کے باوجود انھیں دہشت گرد اور انتہا پسند اور طرح طرح کے الزامات، میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے جن ممالک کو سائنسی فوقیت حاصل ہے ان طاقتوں کو سوچنا چاہیے کہ مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کی مستقل آویزش کیا ان قوموں کے حق میں بہتر ہوسکتی ہے؟ یہ مغربی اقوام اور سپر طاقتوں کا اندھا پن ہے وہ اپنی ان حرکتوں سے آنے والی نسلوں میں ایک ایسی مستقل آویزش کو جاری رکھنا چاہتے ہیں جو انسانیت کے لیے کسی طور پر بھی مثبت نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بین المذاہب مکالمہ کا اہتمام ہونا چاہیے۔ مختلف تہذیبوں اور ادیان کے درمیان جان پہچان ہونی چاہیے کہ مسلمان اپنے عقیدے اور ایمان کے لحاظ سے نہ تو دہشت گرد ہیں نہ وہ انتہا پسند ہیں اور نہ ان پر دقیانوسی کی کوئی پھبتی کسی جاسکتی ہے۔ مسلمان ایک ایسی فکر اور عقیدے کے حامل ہیں کہ جن کے ہاں دوسروں کے لیے محبت اور سلامتی کا پروگرام ہے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یہود کو دنیا میں جب کہیں پناہ نہیں ملی تھی تو مسلمانوں کی ریاستوں میں انھیں پناہ ملی۔ بدقسمتی کی بات ہے کل تلک

جن کو وہ پناہ دینے والا سائبان سمجھتے تھے آج ان کی نسلوں کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔انھیں سوچنا چاہیے کہ جرمنی کے اندر مسلمانوں نے تو ان سے انتقام نہیں لیا لیکن ان کے ساتھ جو ظلم پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان ہوا اس ظلم کا سبب مسلمان نہیں ہے۔بدلہ ان سے لینے کی بجائے ہم سے کیوں لینا چاہتے ہیں۔کتنی بڑی بے انصافی اور اندھا پن ہے اور پھر اسرائیل جو ناجائز سیاسی بچہ ہے مغربی قوتوں کا،انھیں یہ سوچنا چاہیے کہ پورے عالم کو وہ کن نتائج سے دوچار کرنا چاہتے ہیں اور پھر ان کے پاس بدترین قسم کا آتشی اسلحہ اور جوہری ہتھیار لیکن وہاں فلسطینیوں کے جذبوں کو وہ آج تک کچل نہیں سکے اور نہ کچل سکیں گے۔اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اقوامِ عالم کی عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سیاسی جدوجہد اور مکالمے کا تصور پیدا کریں،ورنہ جس قسم کے راستے کو انھوں نے اختیار کر رکھا ہے ان کے لیے بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہلاکت کا راستہ ہے۔مسلمان کل بھی امن پسند تھے اور آج بھی امن پسند ہیں اور آئندہ بھی امن پسند رہیں گے۔نہ ہم کسی کی آزادی کو چھینتے ہیں اور نہ اپنی آزادی کو چھیننے دیں گے۔اگر مسلمانوں کی دیوار کے ساتھ لگانے کا یہ طرزِ عمل جاری رہا تو مستقبل میں کوئی بھی بڑا حادثہ پیش آسکتا ہے جب آپ کسی کو اس درجہ مجبور اور بے کس کر دیں کہ زندگی کا حق بھی چھین لیں تو وہ اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔

آج کل امریکہ مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کر رہا ہے،دراصل وہ ایک عرصے سے اس خوف کے اندر مبتلا ہے کہ کوئی مسلمان ملک ایسی قوت کا حامل نہ بن جائے جو کل کو اسرائیل کی ریاست کے لیے مشکلات پیدا کر سکے۔اس خوف نے انھیں ایک منفی منصوبہ بندی پر مجبور کیا ہوا ہے،میں ان سے پوچھتا ہوں کہ عالم اسلام کا کون سا ایسا ملک ہے جو اپنی جغرافیائی حدوں سے باہر نکل کر کسی کے لیے تکلیف پیدا کر رہا ہے یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ کیا دنیا کے کسی ملک کو بھی امریکہ اجازت دے گا ان کے ملک کے اندر حقوق کا مسئلہ ہو اور تمہارے اندر یہ ہو رہا ہے یہ کیسا دوہرا معیار ہے کہ جو بات امریکہ اپنے ملک کے لیے پسند نہیں کرتا تو وہ کسی دوسرے ملک کے لیے کیوں پسند کرتا ہے۔اسے یہ لائسنس کس نے دیا ہے کہ وہ دنیا کے کسی ملک کی آزادی کو پامال کرتا چلا جائے پھر وہ عالمی حقوق کا چیمپئن اور ٹھیکیدار بھی کہلائے۔اس کی یہ دھونس اور دھاندلی زیادہ دیر نہیں چلے گی۔شعور کی آنکھ کھلی ہوئی ہے میڈیا ترقی کر چکا ہے اب کسی قوم کا کسی دوسری قوم کو نگلنا اتنا آسان نہیں ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ ہماری اقتصادی صورتِ حال نے ہماری سیاسی آزادی کو مشکوک بنا رکھا ہے اس میں بھی عالمی قوتوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے اور اب وہ اس قسم کے بین الاقوامی،تجارتی معاہدے کر رہے ہیں کہ جس کے ذریعے عالم اسلام کو مستقبل میں زیادہ سے زیادہ غلامی کے اندر رکھا جا سکے۔بدقسمتی سے عالم اسلام کی بونی قیادت کے اندر بھی یہ احساس نہیں ہے کہ وہ کس طرح عالم اسلام کے قدرتی وسائل کو مسلمانوں کے لیے محفوظ اور کارآمد بنا سکے۔اس وقت عالم انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تمام قومیں اپنے طرزِ عمل پر پھر سے نظر ثانی کریں اور مستقبل کے امن عالم کے لیے اقدامات کرے۔

موجودہ صورتِ حال مستقبل کے عالمی امن کے لیے خطرے کی مستقل گھنٹی ہے۔ملت اسلامیہ اپنی تمام تر مظلومیت کے باوجود وہ کردار ادا کرنے کے قابل ہے جو عالمی امن کی ضمانت فراہم کر سکتی ہے۔یہ مختلف خطوں میں مسلمانوں کی جانب سے جو ردّعمل کا اظہار ہوتا ہے یہ فطری ردّعمل ہے۔اگر آپ مستضعفین فی الارض کو دیواروں سے لگانے کی پالیسی جاری رکھیں گے تو ردّعمل تو ہوگا۔اگر آپ کسی کو دبائیں گے تو فریاد کرنے کا حق تو انھیں ہے۔مسلمانوں اور ان کے حقوق کو جس طرح پامال کیا جا رہا ہے یہ طرزِ عمل زیادہ دیر نہیں چلے گا۔عالمی قوتوں کو ہم سنجیدگی سے یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی صورتِ حال اور لائحہ عمل اور حکمت عملی پر نظر ثانی کریں یہ کھیل خود ان کے مستقبل کے لیے بھی پریشانی کا باعث بنے گا۔

شدت پسند تنظیموں کے طرزِ عمل کے حوالے سے پوچھے گئے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ میرے نزدیک جب ردّعمل ہوتا ہے تو ردّعمل میں بعض اوقات ایسے افراد شامل ہو جاتے ہیں جو فطری کی بجائے غیر فطری انداز اختیار کرتے ہیں۔مجھے اس سے اتفاق ہے لیکن اس صورتِ حال

کے محرکات پر غور کرنا چاہیے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب تک مغرب اور یورپ کو روس کے اشتراکی نظام کے سامنے حد بندی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ان لوگوں کو مجاہد قرار دیتا رہا، اسلحہ اور وسائل دیتا رہا اور جب وہ مقاصد پورے ہو گئے تو انھیں آج ایک نئے انداز کے ساتھ نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ یہ بڑی بدعہدی اور بے وفائی کی داستان ہے جو ان کے ساتھ اختیار کی جا رہی ہے۔ ہم کسی ایسے مسلم گروہ کی حمایت نہیں کرتے جو امن کی بجائے فساد اور شقاوت پیدا کرتا ہے لیکن یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ اس صورتِ حال پر لوگوں کو آمادہ کرنے میں مغرب کا طرزِ عمل بھی ہے جو انھیں ایسا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ مسلمانوں کو اپنی امن کی بنیادی تعلیم کو عام کرنا چاہیے۔ دوسری طرف عالمی قوتوں کو بھی اس درجہ بہیمانہ کارروائیاں نہیں کرنی چاہئیں جن سے اس قسم کے بدنما حادثات پیدا ہوں۔

نظامِ تعلیم کے حوالے سے پوچھے گئے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اسلام ایک ثقافتی عمل ہے کہ اس کو مٹانے کے لیے کسی قسم کی منصوبہ بندی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس ملک میں ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک انگریز نے بڑی قوت کے ساتھ اس ملک پر حکومت کی ہے۔ لیکن وہ دوقومی نظریے اور اسلامی ثقافت کو ختم نہیں کر سکا۔ اسی فکر کی بنیاد پر یہ ملک معرض وجود میں آیا۔ اگر اتنی بڑی مجبوریوں میں ایک صدی کے اندر وہ اس بنیاد کو ختم نہیں کر سکے اور اب تو ہم آزاد ہیں اور ہمارا آئین ہمارے نظریے اور عقیدہ کا محافظ ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ بعض بین الاقوامی قوتیں اس طریقے سے مداخلت کر رہی ہیں کہ جس سے ہماری سیاسی آزادی مجروح ہو رہی ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے ملک کا وہ اتنا بڑا فیصلہ کریں کہ جس سے ہماری آزادی اور تشخص کے لیے کوئی مسئلہ بن جائے نہ ایسا ہے اور نہ ایسا ہوگا۔ ہمارے اداروں میں ایسی حب الوطنی اور اسلام پسندی موجود ہے کہ کوئی آسانی سے وار نہیں کر سکتا۔ مجھے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

میرا علامہ اقبال کی طرح نظریہ ہے کہ اسلام نے ہمیشہ مسلمانوں کو پناہ دی ہے اور اسلام مسلمانوں کا محتاج نہیں ہے مسلمان اسلام کے محتاج ہیں۔ ملت اسلامیہ کے تمام بحران اسلام کی آفاقی قدروں کی بحالی سے حل ہو سکتے ہیں اور ان شاءاللہ احیائے اسلام کی تحریکیں مثبت طور پر آگے بڑھ رہی ہیں اور ہمیں اسلامی تصورات کے ساتھ یہاں بہتر مستقبل دکھائی دیتا ہے۔ یہ ملک بیسویں صدی کا سب سے بڑا سیاسی معجزہ ہے۔ اسے قضا وقدر کی قوتوں نے بڑے عجیب طریقے سے پیدا کیا ہے اور وہ قوتیں آج بھی اس کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ کوئی ایسی کوشش جو اس ملک کے کلچر کو لادینیت میں بدل سکے ممکن نہیں ہوگا۔ اس وقت جو حالات ہیں اس میں مسلمانوں کی مغلوبیت تو ہوسکتی ہے لیکن اسلام کے غلبے کو کوئی نہیں روک سکتا۔ مسلمانوں کی مغلوبیت کے کچھ اسباب ہیں وہ اگر رفع ہو جائیں تو سربلند ہوتے جائیں گے۔ یہ کشمکش ازل سے جاری ہے اور ابد تک رہے گی۔

ہمارے عقیدے اور پیغام کے اندر ایک فطری قوت ہے اور اخلاقی برتری موجود ہے۔

ایک سوال کہ آج اگر علامہ اقبال زندہ ہوتے تو اپنے ملک کو درپیش مسائل کے تناظر میں وہ کون سی راہ اختیار کرتے، کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اقبال چوں کی اسلامی فکر کے نمائندے ہیں اور اقبال نے بڑے واضح طور پر کہا کہ آنے والے زمانے کی مسلمان ریاستوں کی روح جمہوریت اور مزاج ہے۔ وہ ان کی پارلیمنٹ ہے، وہ آمریت کی بجائے جمہوریت کی روشنی سے آگے بڑھتے اور نظریاتی قوت کو ایک دفاع کے طور پر اپنے ساتھ رکھتے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اقبال شاعر اور پیامبر تھے۔ آج کے حالات میں وہ مایوس ہونے کی بجائے وہ راہنما اصول پیش کرتے جو قوموں کی زندگی کے ان کے وقار کے ضامن بنتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر اقبال موجود نہیں مگر ان کی فکر ہمارے پاس موجود ہے اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فکر اقبال کی بنیاد پر دوقومی نظریہ سامنے آیا۔ مسلمانوں کا ایک سیاسی کلچر ہے وہ کمزور نہیں ہے وہ اگر کل کے بدترین حالات کے اندر مملکت کو جنم لے سکتا ہے، ایک مملکت جو بن چکی ہے اس کو عظیم تر مملکت بنانے کے لیے کیوں نہیں کام کر سکتا۔ ہمارے ملک کے اندر وقفے وقفے سے سیاسی عمل میں

بڑی رکاوٹیں پیدا ہوتی رہی ہیں اب ہمارے تمام طبقات کو یہ احساس ہے کہ اس قسم کے تغیرات کو ہمارے ملک کو فائدے کی بجائے نقصان ہو رہا ہے۔ آج فکر عمل کا جو توازن پیدا ہو رہا ہے یہ بھی فکر اقبال کی وجہ سے ہے۔

کتاب شناسی اور کتاب بینی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کا مطالعہ کثیر الجہات تھا۔ اگرچہ ان کی خطابت اردو زبان میں ہوتی تھی لیکن عربی، فارسی اور انگریزی میں بھی اظہار خیال پر ان کو مکمل دسترس حاصل تھی۔ اقبال شناسی اور سیرت النبی ﷺ پر ان کے خطابات کو اگر مدوّن کیا جائے تو یقیناً ایک ضخیم ذخیرہ معرضِ وجود میں آ سکتا ہے۔ پبلک لائبریریز کی نظامت سے وابستگی ان کا شوق مطالعہ اور کتب و رسائل سے محبت تھی اس کے علاوہ قرآن بورڈ کے ممبر بھی رہے۔ کتب کی عالمی نمائشوں میں نہ صرف شرکت بلکہ وہاں سے قیمتی مطبوعات خرید کر اپنی ذاتی لائبریری بیت الحکمت کو مزین کرتے تھے۔

راقم کی نظر میں ان کا سب سے بڑا یادگار اور منفرد کارنامہ اسی بیت الحکمت کا قیام ہے۔ یہ لائبریری احادیث اور سیرت کے موضوع پر ۱۸ زبانوں میں چار ہزار سے زائد کتب پر مشتمل ہے۔ چالیس زبانوں میں چار ہزار پانچ سو کتب ومقالات اقبالیات کے موضوع پر اس لائبریری کی زینت ہیں۔ بیت الحکمت کی مطبوعہ کتب کی تعداد ایک لاکھ سے زاید ہے۔

۱۹۸۶ء میں صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے اسی بیت الحکمت کے گراں قدر اور وسیع ذخیرے کی بناء پر انھیں سیرت کا خاص ایوارڈ دیا۔ حکومت ایران نے مخطوطات کی عالمی نمائش کے موقع پر انھیں عالمی سطح کا تیسرا انعام دیا۔ ۲۰۰۵ء کو فیصل مسجد میں قرآنِ مجید کی خطی نمائش منعقد کی جس کا افتتاح اس وقت کے صدر جنرل پرویز مشرف نے کیا۔ اس لائبریری کے ذخیرہ کی فہرست سازی جامعات پاکستان کے مختلف طلبا نے سات مقالات کی صورت میں مکمل کی۔ یہی بیت الحکمت علم کا چشمہ فیض اور عقبہ میں ان کے لیے صدقہ جاری ہے۔ محققین خواہ وہ دینی اداروں سے تعلق رکھتے ہوں یا جامعات پاکستان سے سبھی ان کے ذخیرہ کتب سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ اگرچہ اولاد صالح بھی صدقہ جاریہ اور اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہے۔ تاہم بیت الحکمت ان کے کارِ خیر میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

ویراں ہے مے کدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے



جامعہ محمدیہ قدوسیہ کوٹ رادھا کشن میں تدریسی سرگرمیاں

معروف دینی تعلیمی ادارے جامعہ محمدیہ قدوسیہ کوٹ رادھا کشن میں ایک مزید عالم فاضل قاری صاحب کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو شعبہ تحفیظ القرآن میں تدریسی خدمات انجام دیں گے۔ جامعہ میں ترجمہ قرآن اور سکولوں کے طلباء کے لیے عربی واسلامیات کی تدریسی کلاسیں بھی شروع کی جا رہی ہیں۔

طلباء کے لیے قیام وطعام کی تمام سہولیات حاصل ہوں گی۔ طلباء اور ان کے والدین اس سنہری موقع سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔

[مدیر التعلیم، جامعہ محمدیہ قدوسیہ کوٹ رادھا کشن، ضلع قصور]

پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ

محمد رمضان یوسف سلفی (فیصل آباد)

ستمبر ۱۹۹۹ء کے دوسرے ہفتے ایک روز صبح ہی صبح میرے بزرگ دوست پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد دین قاسمی صاحب حفظہ اللہ تشریف لائے۔ سلام دعا کے بعد فرمانے لگے میں لاہور پنجاب پبلک لائبریری لاہور گیا تھا۔ وہاں پنجاب پبلک لائبریریز کے ڈائریکٹر سے ملاقات ہوئی۔ وہ ۷ ستمبر کو فیصل آباد خطبہ جمعہ ارشاد فرمانے آ رہے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ اس روز انھیں فیصل آباد میں کسی بڑی لائبریری کی سیر کرائی جائے۔ راقم نے قاسمی صاحب سے کہا کہ وہ بلا دھڑک اپنے اس دوست کو دعوت دے دیں۔ ہمارے دوست علی ارشد چودھری کی بہت بڑی لائبریری ہے جو ہزاروں نادر ونایاب کتب پر مشتمل ہے ان کو وہ دکھائیں گے۔

چناں چہ وقت مقررہ پر وہ محرم جاں چوک گھنٹہ گھر فیصل آباد پہنچ گئے۔ علی ارشد چودھری مرحوم، ڈاکٹر حافظ محمد دین قاسمی اور راقم محمد رمضان یوسف سلفی ان کی آمد کے منتظر تھے۔ میانہ قد، کشادہ پیشانی، خوب صورت داڑھی، روشن آنکھیں، چمکتے دانت، نورانی چہرہ، پروقار چال، شلوار قمیض زیب تن، بائیں ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ۔ وہ مسکراتے ہوئے ہماری طرف بڑھے، پہلے معانقہ اور پھر سب سے مصافحہ کیا۔ ڈاکٹر قاسمی صاحب نے پہلے علی ارشد چودھری اور پھر میرا ان سے تعارف کرایا۔ وہ محبت بھرے لہجے میں کہنے لگے رمضان یوسف سلفی تو ہمارے رسائل کا معروف نام ہے۔ ان کے مضامین تو میں جماعتی رسائل میں اکثر پڑھتا ہوں۔

یہ تھے معروف علمی شخصیت پروفیسر عبدالجبار شاکر۔ جن کی کتاب دوستی، علم وحلم، تحریر وتقریر اور ادب وانشاء کے چرچے میں نے عرصہ پہلے اپنے بعض کرم فرماؤں سے سن رکھے تھے۔

تعارف کے بعد ہمارے دوست علی ارشد چودھری، شاکر صاحب کو اور ہمیں اپنے گھر لے گئے اور انھوں نے شاکر صاحب کو اپنی لائبریری جو ''بیت الکتب'' کے نام سے موسوم تھی دکھائی۔ علی ارشد صاحب کی وفات ۱۷ فروری ۲۰۰۹ء کے بعد اب یہ لائبریری فروخت ہو کر میلسی ضلع وہاڑی سردار پور میں واقع مسعود جھنڈیر کی لائبریری کا حصہ بن چکی ہے۔ شاکر صاحب لائبریری دیکھ کر وفور مسرت سے جھوم اٹھے۔ اس دن ہم چار پانچ گھنٹے پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب کے ہمراہ رہے اور نماز جمعہ بھی ہم نے ان کی اقتداء میں ادا کی۔ انھوں نے اپنی گفتگو سے خوب محظوظ کیا اور کتابوں اور کتاب دوستی کے حوالے سے بہت سی باتیں اپنے اسلوب خاص میں سنائیں۔ کتاب اور کتابوں والے ہی ان کے دوست تھے اور یہی ان کا خاندان۔ گاہے گاہے وہ فیصل آباد تشریف لاتے تو کبھی جامعہ سلفیہ اور کبھی علی ارشد چودھری کے ہاں ان سے ملاقات ہو جاتی۔

ان سے میرے مراسم گزشتہ دس سال سے قائم تھے۔ جہاں ملے جب بھی ملے نہایت خندہ پیشانی اور محبت سے ملے۔ اور کتابوں کے بارے ہی اکثر گفتگو ہوتی۔ ایک بار فیصل آباد تشریف لائے، ہمارے دوستوں نے ان کی لائبریری ''بیت الحکمت'' دیکھنے کی خواہش کی۔ شاکر صاحب علی ارشد صاحب کو مخاطب کر کے فرمانے لگے ارشد صاحب جب جی چاہے تشریف لائیں ہم تکلف سے کام نہیں لیتے، مسور کی دال کے ساتھ دہی بڑھا دیں گے۔ ان کے اس جملے نے خوب محظوظ کیا۔

۱۹ دسمبر ۱۹۹۹ء کو ہم تین دوست علی ارشد صاحب کی گاڑی میں لاہور گئے۔ لاہور سے ہم نے مولانا محمد ادریس ہاشمی صاحب مدیر ماہنامہ صدائے ہوش لاہور کو بھی ہمراہ لے لیا اور عشاء کے بعد حبیب پارک منصورہ میں واقع شاکر صاحب کی لائبریری میں پہنچ گئے۔ تھوڑے انتظار کے بعد پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب اور ان کے صاحبزادۂ گرامی قدر برادرم جمال الدین افغانی صاحب بھی تشریف لے آئے۔ پانچ منزلہ یہ لائبریری دیکھ کر جو خوشی ہوئی اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن، حدیث، تفسیر، شروحات، قلمی مخطوطے، کتب سیرت، اقبالیات، رسائل غرض دنیا جہان کی مختلف زبانوں پر کتب نہایت قرینے اور سلیقے سے رکھی گئی تھیں۔ شاکر صاحب ایک ایک کتاب اور قلمی مخطوطہ بڑی محبت اور شیفتگی سے ہمیں دکھا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اس بارے معلومات بھی دے رہے تھے کہ یہ کتاب پہلی بار کب شائع ہوئی اور یہ قلمی مخطوطہ کس سن ہجری کا ہے۔ نادرونایاب قسم کی کتابیں جمع کرنا ان کا شوق تھا اور پھر ان کی حفاظت کرنا بھی۔ فرمانے لگے ''میں تو خود یہ تصور نہیں کرسکتا کوئی پمفلٹ بھی لے کر لائبریری سے باہر جاؤں۔''

سیرت النبی ﷺ اور اقبالیات پر بہت بڑا ذخیرہ اور ہزاروں قلمی مخطوطے شاکر صاحب کی لائبریری کی زینت تھے۔ ذاتی لائبریریوں میں شاید اتنا بڑا ذخیرہ کسی اور کے پاس نہ ہو۔ ۱۹ اور ۲۰ دسمبر ۱۹۹۹ء کو رات ہم نے ان کے بیت الحکمت میں بسر کی۔ وہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ صبح سحری میں انھوں نے پرتکلف انتظام کیا۔ دیسی گھی کے پراٹھے، دہی، لسی، مرغی کا گوشت۔ نماز فجر ان کی اقتداء میں ادا کی، اس کے بعد تھوڑی دیر آرام اور پھر واپسی کے لیے رخت سفر باندھا۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب کا ایک ایک نسخہ اپنے دستخطوں سے دیا۔ راقم کی لائبریری میں موجود ان کی اس کتاب کے شروع سادہ صفحے پر ان کی طرف سے یہ الفاظ مرقوم ہیں......

تہدیہ، برادرم محمد رمضان یوسف سلفی کے ذوق علمی کی نذر۔ پروفیسر عبدالجبار شاکر۔ ۱۹۹۹/۱۲/۲۰

اللہ تعالیٰ کا جماعت اہل حدیث پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس جماعت میں بڑے بڑے عظیم لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ جنھوں نے دین اسلام کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں اور نیک نام ہوئے۔ پروفیسر عبدالجبار شاکر بھی انہی میں سے ایک تھے۔ وہ بلند پایہ ماہر تعلیم، کہنہ مشق ادیب ومصنف، خوش بیاں خطیب ومقرر، صاحب طرز ادیب، نامور محقق اور اونچے اخلاق وکردار والے انسان تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سی علمی خوبیوں سے بہرہ مند فرمایا تھا۔ وہ اپنی خداداد ذہانت اور علمی تفوق سے علم وعرفان کی منزلیں طے کرتے ہوئے قصر سلطانی تک پہنچے اور اپنے علم سے چاردانگ عالم کو مستفید کیا۔

اب آیئے ان کے ابتدائی حالات کی طرف!

پروفیسر عبدالجبار شاکر یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو حسین خان والا (ضلع قصور) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالعزیز تھا جو ثقہ عالم دین تھے۔ وعظ وخطابت، طب وحکمت اور زہدوورع میں ان کو اپنے علاقے میں ممتاز مقام حاصل تھا۔ انھوں نے ابتدائی سکول کی تعلیم اپنے گاؤں حسین خان والا میں حاصل کی۔ اس کے بعد دینی تعلیم کے حصول کے لیے مرکز الاسلام لکھو کے اور پھر مدرسہ سعیدیہ دہلی سے اکتساب علم کیا اور مولانا عبدالجبار محدث کھنڈیلوی رحمہ اللہ سے سند فراغت حاصل کی۔ حکیم مولانا عبدالعزیز حسینوی نے درس وتدریس، وعظ وتبلیغ اور طب وحکمت کے ذریعے بڑی خدمت کی۔ انھوں نے ۵۲ سال کی عمر میں ۱۹۶۳ء میں وفات پائی۔ ان کی اولاد میں ایک بیٹی، دو بیٹے عبدالجبار اور عبدالقیوم تھے۔ بڑے صاحبزادے کا نام انھوں نے مولانا امام عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کے نام پر رکھا جس نے آگے چل کر پروفیسر عبدالجبار شاکر کے نام سے شہرت پائی۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب نے ابتدائی تعلیم حسین خان والا کے سکول میں حاصل کی۔ پتوکی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ایف اے اور بی

اے کی ڈگریاں گورنمنٹ کالج ساہیوال سے حاصل کیں۔ ۱۹۶۸ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اورنٹیل کالج میں نمایاں امتیازی نمبروں کے ساتھ ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب کی تدریسی زندگی کا آغاز ۱۹۶۹ء میں گورنمنٹ کالج پتوکی سے ہوا۔ فروری ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۵ء تک آپ لیاقت پور ضلع رحیم یار خاں میں رہے۔ یکم جنوری ۱۹۷۶ء کو آپ گورنمنٹ کالج شیخوپورہ آ گئے۔ اس کالج میں آپ اردو زبان وادب کے استاد کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ ۱۹۸۱ء میں جب حکومت پنجاب نے ڈائریکٹوریٹ آف پبلک لائبریریز قائم کیا تو ۱۹۸۲ء میں اس کے پہلے ڈائریکٹر پروفیسر عبدالجبار شاکر مقرر ہوئے۔ اس عہدہ پر رہ کر آپ نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔

چند سال پہلے حکومت پاکستان نے انھیں الدعوۃ اکیڈمی کا ڈائریکٹر بنا دیا تھا اور آپ اسلام آباد تشریف لے گئے تھے اور ساتھ ہی حکومت نے انھیں فیصل مسجد اسلام آباد کی خطابت کی ذمہ داری بھی سونپ دی تھی۔ اس وقت آپ اسلام آباد میں سیرت چیئر کے چیئر مین تھے۔ پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب کی شخصیت کئی حوالوں سے منفرد تھی۔ شاکر صاحب کی علمی وادبی صلاحیتیں زمانہ طالب علمی میں ہی ظہور پذیر ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اور آپ نے کالج و یونیورسٹی کے دور میں تحریر وتقریر میں اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ آپ ایف اے اور بی اے کی تعلیم کے دوران گورنمنٹ کالج ساہیوال کے ادبی مجلّہ ''ساہیوال'' کے ایڈیٹر رہے۔ ان کی ادارت میں ۱۹۶۵ء میں ''جہاد نمبر'' اور ۱۹۶۶ء میں ''اقبال نمبر'' شائع کیا گیا۔ ''اقبال نمبر'' کو بعد میں بزم اقبال لاہور نے کتابی صورت میں بھی شائع کیا۔

یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران آپ نے سینکڑوں مباحثوں، مذاکروں اور مشاعروں میں شرکت کی اور انعامات حاصل کیے۔ اورینٹل کالج لاہور میں آپ انجمن اردو کے صدر بھی رہے۔

انھیں کتابیں پڑھنے اور جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے بڑی محنت کی۔ تاریخ شیخوپورہ میں ان کے بارے لکھا ہے کہ......

والدین کی جانب سے ملنے والی عظیم الشان ذاتی لائبریری کے علاوہ آپ نے ذاتی ذوق وشوق سے ہزاروں کتابیں لاہور کے فٹ پاتھوں سے خریدیں۔ آپ کے وسعت مطالعہ کی شہرت زمانہ طالب علمی میں زبان زد عام تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ جنون کی شکل اختیار کر گئی۔ آپ کی آبائی زمین تین دیہاتوں میں تھی، جس میں سے دو دیہاتوں سے ملنے والا زرعی ورثہ کتابوں کے شوق میں نیلام ہو چکا ہے۔ صرف ایک گاؤں میں چند ایکڑ اراضی باقی ہے۔ [تاریخ شیخوپورہ، ص:۳۱۹]

گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں سروس کے دوران آپ نے کالج کے ادبی مجلّے کے تین یادگار نمبر ترتیب دیے۔ جو قائداعظم، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں جیسی نامور شخصیات کے بارے میں تھے۔

پروفیسر شاکر صاحب کو ان کی کتاب دوستی اور منفرد لائبریری کے باعث ۱۹۸۶ء میں صدارتی اعزاز وانعام سے بھی نوازا گیا تھا۔ شاکر صاحب بہت پیاری گفتگو کرتے اور عمدہ تحریریں لکھتے تھے۔ زبان وبیان پر ان کو ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے سینکڑوں کتب کے مقدمے اور فلیپ لکھے۔ آپ مختصر تحریر میں پوری کتاب کا نچوڑ پیش کر دیتے تھے۔ اور تقریر ایسی کرتے کہ ہر بات دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی۔ محدثین عظام اور علمائے کرام سے آپ کو بے پناہ محبت تھی کچھ عرصہ پہلے آپ امام بخاری رحمہ اللہ کی قبر پر بھی ہو کر آئے تھے۔ ہندوستان گئے تو وہاں شیخ الکل میاں نذیر حسین رحمہ اللہ کی دہلی میں واقع مسجد اور مدرسہ بھی گئے اور اس تاریخی مسجد میں تقریر بھی کی جہاں میاں صاحب درس دیتے رہے۔ بلاشبہ وہ جماعت اہل حدیث کے عظیم فرزند تھے۔ ایک عرصے سے دل کے مریض تھے لیکن ان کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ۱۳/۱۲ کتوبر ۲۰۰۹ء کی صبح وہ دل کے بائی پاس آپریشن

کے دوران داغ مفارقت دے گئے۔

مجھے ساڑھے دس بجے کے پس وپیش جامعہ سلفیہ فیصل آباد سے میرے عزیز دوست مولانا فاروق الرحمٰن یزدانی صاحب نے یہ اندوہناک خبر سنائی۔ میں نے مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کوفون کیا تو انھوں نے بھی اس کی تصدیق کردی۔ پھر ملک عبدالرشید عراقی صاحب کا فون آ گیا انھوں نے بھی یہی خبر سنائی۔ اس کے بعد وطن عزیز کے طول وعرض سے بہت سے لوگوں کے فون آئے اور انھوں نے شاکر صاحب کی وفات پر افسوس کا اظہار کیا۔

نماز مغرب کے بعد ڈاکٹر انور محمود خالد، محمد فرقان، مولانا زبیر ناصر اور راقم شیخو پورہ روانہ ہوئے۔ جب ہم کمپنی باغ پہنچے تو جنازہ بالکل تیار تھا۔ اور لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نماز جنازہ میں شرکت کے لیے امڈ آیا تھا۔ رات ساڑھے نو بجے حافظ مسعود عالم صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے ہزاروں لوگ شاکر صاحب کے لیے دعائے مغفرت کررہے تھے۔ جامعہ سلفیہ فیصل آباد کے اساتذہ اور طلباء خصوصی طور پر نماز جنازہ میں شریک ہوئے اور دیگر اہل حدیث علماء اور اکابرین نے بھی شرکت کی۔

نماز جنازہ کے بعد ہم نے شاکر صاحب کا چہرہ دیکھا تو اس پر نورانیت کا غلبہ تھا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے گہری نیند سو رہے ہوں۔ رات گیارہ بجے ان کی تدفین شیخو پورہ کے مقامی قبرستان میں کی گئی۔

شاکر صاحب کی وفات سے پاکستان میں علم وادب کا ایک عظیم ستارہ غروب ہوگیا۔ انھوں نے اپنے پیچھے بیوہ، ۶ بیٹے، دو بیٹیاں اور ہزاروں عقیدت مند سوگوار چھوڑے ہیں۔ ان کے بیٹوں کے نام یہ ہیں:

① ......صلاح الدین ایوبی (لیکچرار)

② ......جمال الدین افغانی (تاجران کتب)

③ ......رفیع الدین حجازی (تاجر کتب)

④ ......کبیر الدین رازی (سرکاری ملازم)

⑤ ......جلال الدین رومی (طالب علم)

⑥ ......نجم الدین فارانی (طالب علم)

ماشاء اللہ شاکر صاحب کی تمام اولاد پڑھی لکھی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کے صاحبزادے اپنے والد محترم کے علمی ذخیرے کی عمدگی سے حفاظت فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ اپنے پیارے بندے پروفیسر عبدالجبار شاکر کو جنت الفردوس میں ارفع مقام عطا فرمائے، آمین۔



آہ! پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ

پروفیسر سعید احمد چنیوٹی (فیصل آباد)

نہایت افسوس کہ کہنہ ادیب شاعر بے مثل خطیب، عظیم سکالر، متنوع اوصاف کا حامل، یگانہ روزگار علمی وادبی مجلسوں کی زینت پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ ۱۳/اکتوبر وفات پا گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قحط الرجال کے دور میں ان کی وفات بیک وقت علمی، ادبی اور دینی حلقوں کے لیے عظیم اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ملک وقوم اور جماعتوں کو ایسے بے لوث اور محنتی افراد کی اشد ضرورت ہے جو لوگوں پر بوجھ بننے کی بجائے دوسروں کا بوجھ اٹھائیں۔ قومی اور ملّی درد کو ذاتی اغراض پر ترجیح دیں۔ تحقیق وریسرچ کی شمع روشن کر کے متلاشیانِ حق کی راہنمائی کریں۔ اپنا گھر جلا کر علم کی بستیاں آباد کریں۔ اپنی جائیدادیں تج کر کے شمع علم کو فروزاں کریں، قوموں سے لینے کی بجائے انھیں کچھ دینے کا ذوق ہو۔ موجودہ مادی دور اور افراتفری کے عالم میں ایسے افراد کا وجود غنیمت تھا۔ ایسے اشخاص جنھیں اپنے فن سے پیار ہو، ذوق سے عشق ہو، رجحانات سے جنوں ہو، مذہب سے وابستگی اور ملت سے وارفتگی ہو۔

پروفیسر شاکر صاحب ہمہ جہت کمالات واوصاف کے مالک تھے، ایک طرف ادبی محفلوں کی زینت، ادھر چراغ محراب ومنبر، کتابوں کے مولف، مقبول ترین ادیب وشاعر، علمی اداروں اور اکیڈمیوں کے رکن، علوم ادبیہ کا یگانہ، علوم عربیہ کا خزانہ، علوم عقلیہ کا ناقد، علوم دینیہ کا ماہر، فن سیرت کا واقف، اسرار اقبالیات کا دانائے رموز، گوشہ علم کا معتکف ہم سے جدا ہو گیا۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حالاتِ زندگی:

مرحوم کے خاندانی پس منظر میں اس قدر ہی بتانا مقصود ہے کہ آپ کے والد محترم حکیم عبدالعزیز راجپوتوں کے متوسط درجہ کے زمیندار گھرانہ سے تعلق رکھتے ہوئے عالم دین اور مستند حکیم بھی تھے۔ ان کے ہاں جب یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو یہ بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام عبدالجبار رکھا جو علمی دنیا میں عبدالجبار شاکر کے نام سے مشہور ہوا۔

پروفیسر صاحب نے تعلیم کا آغاز عصری علوم کی تحصیل سے کیا۔ مڈل تک کی تعلیم چونیاں اور اپنے گاؤں حسین خان والہ میں حاصل کی۔ پھر میٹرک، ایف اے، بی اے کرنے کے بعد ۱۹۶۸ء میں پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے اردو کا امتحان نمایاں پوزیشن میں پاس کیا۔ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران آپ نے سینکڑوں مباحثوں، مذاکروں اور مشاعروں میں شرکت کی اور انعامات وصول کیے۔ طالب علمی ہی سے انھیں ذوقِ مطالعہ سے آشنائی تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جنوں کی شکل اختیار کر گئی۔ آپ کی آبائی زمین میں سے اکثر رقبہ کتابوں کے شوق میں نیلام ہو چکا۔ کتابوں کو جمع کرنے کا شوق آہستہ آہستہ بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ آپ کا کتب خانہ عالمی شہرت اختیار کر گیا جس میں کتب کی تعداد لاکھ سے متجاوز ہو گئی۔ جس میں ہزاروں کی تعداد میں مخطوطات اس کے علاوہ ہیں۔

ملک میں لائبریریاں تو بہت ہیں لیکن پروفیسر صاحب کی لائبریری کا امتیاز یہ ہے کہ جس قدر سیرت کے موضوع پر کتابیں ان کے پاس ہیں ملک کی کسی لائبریری میں یہ اثاثہ اس تعداد میں نہیں ہے۔ اب انھوں نے منصورہ (لاہور) کے بالمقابل ''بیت الحکمت'' کے نام سے عظیم لائبریری قائم

کی ہے جس پر ۱۹۸۶ء میں انھیں صدارتی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

آج کل وہ سیرت کے موضوع پر جامع اور حیرت انگیز ریسرچ میں مصروف تھے جو سابقہ کتب سیرت کے مقابل ایک منفرد کام تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے رفقاء کو اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

فیصل آباد سے ایک طالب علم نے ٹیلی فون پر پروفیسر صاحب سے ان کے اس کام کے متعلق دریافت کیا تو جواب فرمایا کہ بیٹا سیرت کا یہ کام آپ کی فکر اور رساء ذہنی سے کہیں بلند تر ہے۔

ان کے زاویہ تحقیق کا دوسرا ہدف اقبالیات تھا جس سے انھیں دورِ طالب علمی ہی سے شغف رہا۔ جب آپ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں زیر تعلیم تھے تو کالج کے ادبی مجلّہ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ تو آپ کی ادارت میں ۱۹۶۵ء میں جہاد نمبر اور ۱۹۶۶ء میں اقبال نمبر شائع ہوئے۔ بعد میں بزم اقبال نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔ پھر گورنمنٹ کالج شیخو پورہ میں زبان وادب کے استاذ کی حیثیت سے مقرر ہوئے تو ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کے صد سالہ یومِ ولادت کی تقریبات کے موقع پر عظیم علمی نمائش کا اہتمام کیا۔ اور ساتھ ہی ادبی مجلّہ کے تین یادگار نمبر ترتیب دیے جو قائداعظم، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی کی نامور شخصیات کے بارے میں تھے۔ لاہور ملازمت کے دوران ۱۹۹۵ء میں اقبالیات میں ایم فل کیا۔ بہر حال وہ اقبالیات کے سپیشلسٹ تھے۔

اسی مناسبت سے انھوں نے مختلف اداروں میں لیکچر دیے۔ سول سروس اکیڈمی، پی سی ایس، آفیسر ٹریننگ اکیڈمی، پنجاب انجینئرنگ اکیڈمی مرکزیہ مجلس اقبال کے پلیٹ فارموں سے ان کے خطابات اور تقاریر ہوئیں۔ اسی دوران دنیا کے بہت سے ممالک میں علمی سیاحت کی اور وہاں خطبات پیش کیے۔

میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ وہ واپسی پر مختلف تقریبات میں بیرون ملک سیاحت کے مشاہدات اور علمی تاثرات سے حاضرین کو محظوظ فرماتے اور علمی اداروں اور طلباء کو ایسے قابل تقلید کارنامے سرانجام دینے پر ابھارتے۔

ان کا دورانیہ خطاب اگرچہ ۳۰، ۳۵ منٹ کا ہوتا مگر اس مختصر خطاب میں وہ حاضرین میں روح پھونک دیتے۔ آج سے کوئی ۲۰ سال قبل کی بات ہے کہ کسی عزیز کی تیمارداری کے لیے شیخو پورہ جانا ہوا۔ جمعہ کا روز تھا ہسپتال کے قریب ہی پرانا لاری اڈا کی مسجد میں ادائیگی جمعہ کے لیے گیا تو پروفیسر صاحب کا خطبہ سن کر تعارف وعقیدت کے جذبات نے جنم لیا اور ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہو گیا۔ اس کے بعد متعدد پروگراموں کے سلسلہ میں فیصل آباد تشریف لاتے تو طارق اکیڈمی پر مجلس ہوتی۔ جامعہ سلفیہ میں تقریب بخاری کے موقعہ پر ان کا خطاب ہوتا ہر سال نیا موضوع اور نیا انداز ملتا۔

بطور لیکچرر ملازمت کا آغاز تو انھوں نے ۱۹۷۱ء سے کیا مگر انتظامی عہدے پر فائز ہونے کا آغاز ۱۹۸۱ء میں ہوا جب حکومت پنجاب نے ڈائریکٹوریٹ آف پبلک لائبریریز قائم کیا تو ۱۹۸۲ء میں آپ اس کے پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ پھر ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے دعوۃ اکیڈمی فیصل مسجد اسلام آباد کے ڈائریکٹر اور فیصل مسجد کے خطیب ہونے کا اعزاز ملا۔ ان مراتب پر فائز ہونے کے لیے کسی سفارش یا رشوت کا سہارا نہیں لیا بلکہ ان کی ذاتی قابلیت، علمی صلاحیت اور ان کی خدمات کا صلہ تھا جس کا عملی اظہار اکتوبر شام ساڑھے نو بجے کمپنی باغ شیخو پورہ میں ایک باوقار اجتماع اور ہر طبقہ حیات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے جم غفیر سے ہو رہا تھا کہ لوگ پروانہ وار جنازہ میں شرکت کے لیے آ رہے تھے۔ اس موقعہ پر امام اہل سنت کا یہ جملہ یاد آ رہا تھا: **بيننا وبينكم يوم الجنائز**

دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کی خدمات جلیلہ کو شرفِ قبولیت دے کر ان کی مغفرت اور رفع درجات کا سبب بنائے اور ان کے شروع کیے ہوئے علمی منصوبوں کی تکمیل کے لیے افراد کو کام کرنے کی توفیق دے۔ آمین یا ربّ العالمین



پروفیسر عبدالجبار شاکر کی یاد میں

محمد خالد سیف

قریباً دس بارہ برس قبل ایک مہمان گرامی غریب خانہ پر تشریف لائے۔ سفید شلوار قمیص اور سیاہ رنگ کی واسکٹ میں ملبوس، سر پر قراقلی ٹوپی، مقدس نورانی شکل، چہرے پر تمکنت اور وقار، آنکھیں کثرت مطالعہ کی غماز، میں ابھی آنے والے اس مہمان گرامی کی شخصیت کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ انھوں نے یہ کہہ کر میری الجھن کو دور کر دیا کہ مجھے پروفیسر عبدالجبار شاکر کہتے ہیں۔ اسلام آباد کسی کام سے آیا تھا، سوچا کہ آپ سے بھی ملاقات کرتا جاؤں۔ یہ جناب پروفیسر عبدالجبار شاکر مرحوم سے میری پہلی ملاقات تھی، جس کی یاد ابھی تک ذہن پر نقش ہے۔ بہر حال یہ ان کی عظمت تھی کہ گلستان میں بھی بیابان کی طرح رہنے والے ایک گمنام طالب علم سے ملاقات کے لیے وقت نکالا اور غریب خانہ پر تشریف لانے کے لیے زحمت فرمائی۔ گفتگو سے میرے اس تاثر کی تائید ہوئی کہ آپ کو مطالعہ کتب کا بہت شوق ہے اور اس شوق کی تسکین کے لیے آپ نے اچھا خاصہ ذخیرۂ کتب بھی فراہم کر رکھا ہے۔

پروفیسر شاکر صاحب سے دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب چند سال قبل طارق اکیڈمی فیصل آباد کی تجدید نو کی مناسبت سے ایک علمی تقریب کا انعقاد کیا گیا، جس کے مقررین میں جناب ڈاکٹر اسرار احمد کے ساتھ جناب پروفیسر عبدالجبار شاکر بھی تھے۔ ہر چند کہ میدان خطابت میں جناب ڈاکٹر اسرار احمد کا بھی ایک نام ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس تقریب میں پروفیسر شاکر صاحب چھا گئے تھے۔ سامعین نے جن کی اکثریت علماء وفضلاء، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دینی مدارس کے اساتذہ کرام پر مشتمل تھی، آپ کے خطاب کو بے حد پسند کیا۔ راقم الحروف نے اس تقریب کی روداد بھی لکھی تھی، جو ''علم وآگہی'' میں شائع ہو چکی ہے۔

مجھے پروفیسر صاحب کے خطاب کو سننے کا یہ پہلا موقع ملا تھا۔ موضوع سے متعلق کثرت معلومات اور خطیبانہ جاہ وجلال کے ساتھ ساتھ زبان میں ایک عجیب شکوہ اور طنطنہ تھا۔ پروفیسر صاحب جب خطاب فرما رہے تھے تو میں ہمہ تن گوش برآواز تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے اردو زبان وتراکیب ہاتھ باندھے دوران خطاب ان سے اپنے استعمال کی التجا کر رہے ہوں۔ ع

تیری آواز کہیں روشنی بن جاتی تھی
تیرا لہجہ کہیں مہکار سے جا ملتا تھا

پھر وہ وقت آیا کہ پروفیسر صاحب ڈیپوٹیشن پر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کی دعوۃ اکیڈمی کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے اسلام آباد میں تشریف لے آئے۔ ان کی اسلام آباد آمد سے بے حد خوشی ہوئی کہ اس طرح ملاقات کے زیادہ مواقع میسر آتے رہیں گے۔ ان کے آفس میں حاضری دی اور کافی دیر تک مختلف علمی موضوعات پر تبادلہ خیال کا موقع ملا، جس سے ان کے مطالعہ کی وسعت اور ذوق کی لطافت وپاکیزگی کا نقش دل ودماغ پر گہرا ہوتا گیا۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے زیر اہتمام طبع ہونے والے سہ ماہی مجلّہ ''اجتہاد'' اور مصری سکالر عبدالحلیم محمد ابوشقہ کی کتاب ''تحریر المرأۃ فی

عصر الرسالة" کے اردو ترجمہ ''آزادیٔ نسواں عہدرسالت میں'' کی تقریب رونمائی مؤرخہ ۲ راگست ۲۰۰۷ءکو نسل کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں اگرچہ کئی اہم شخصیتوں نے شرکت کی لیکن اپنے منفرد خطیبانہ اسلوب وآہنگ کے باعث آپ سب سے فائق تھے۔

آپ ایک نامور علمی شخصیت، سلیقہ وشائستگی کے حامل منفرد اسلوب کے خطیب اور ماہر تعلیم تھے۔ اسلام آباد آمد سے قبل انھوں نے پنجاب کے مختلف کالجوں میں طویل عرصہ تک تدریسی خدمات سرانجام دیں اور پنجاب پبلک لائبریری کے ڈائریکٹر جنرل ایئر کموڈور (ر) انوارالحق کے ساتھ مل کر گوجراں والا، ساہی وال اور کئی دیگر شہروں میں نہ صرف پبلک لائبریریاں قائم کیں بلکہ کئی دیہات میں موبائل لائبریریاں تک قائم کیں، جن میں آپ کے بعد کوئی اضافہ نہیں ہوسکا۔ اسلام آباد میں آپ نے پہلے دعوہ اکیڈمی کے ڈائریکٹر جنرل، پھر دعوۃ وشریعت دونوں اکیڈمیوں کے ڈائریکٹر جنرل اور بلحاظ عہدہ فیصل مسجد کے خطیب کی حیثیت سے کام کیا اور آج کل ڈائریکٹر سیرت چیئر اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے منصب پر خدمات سرانجام دے رہے تھے۔

پہلے یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ آپ نے اپنے مطالعہ کی تسکین کے لیے اچھا خاصہ ذخیرہ کتب فراہم کیا۔ پھر آپ نے اسے ''بیت الحکمت'' کے نام سے باقاعدہ لائبریری کی شکل دے دی، جس میں استفادہ کرنے والے محققین اور سکالرز کے لیے ضروری سہولتوں کا بھی انتظام کیا۔ آپ کی یہ لائبریری کم وبیش ڈیڑھ لاکھ کتب ورسائل پر مشتمل ہے، جس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں صرف سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر مختلف زبانوں میں پانچ ہزار سے زیادہ کتب موجود ہیں۔

ایک بار حج سے واپسی پر ملاقات میں بتانے لگے کہ حرمین شریفین کے مختلف مکتبوں پر تاریخ اور رجال کے موضوع پر جس قدر کتب نظر آئیں میں وہ سب اپنی لائبریری کے لیے خرید لایا ہوں۔ انھوں نے اپنی تنخواہ کا ایک حصہ کتابوں کی خریداری کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ نادر ونایاب کتابوں کی تلاش میں وہ پرانی کتابوں کی دکانوں پر بھی جاتے رہتے تھے اور اس طرح انھوں نے تلاش کرکر کے بہت سے نوادرات اپنی لائبریری میں محفوظ کردیئے ہیں اور اس کے لیے انھوں نے خرمن خرمن اور گلشن گلشن پھر کر ''تمتع زہر گوشہ یافتم'' کا شرف حاصل کیا ہے۔

دواڑھائی ماہ قبل میں ابھی اپنے آفس میں پہنچا ہی تھا کہ پروفیسر صاحب اچانک اسی طرح تشریف لے آئے، جس طرح انھوں نے پہلی بار غریب خانہ کو قدوم میمنت لزوم سے نوازا تھا۔ صبح سویرے اس آمد کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ اس طرف سے گزر رہا تھا تو خیال آیا کہ آپ سے ملتا جاؤں۔ کافی دیر تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا اور پروفیسر صاحب معلومات کے دریا بہاتے رہے۔

اسی ملاقات میں پہلی بار معلوم ہوا کہ آپ بھی ''اہل دل'' میں سے ہیں۔ کیوں کہ آپ نے کچھ بھی کھانے پینے سے یہ کہہ کر معذرت کردی کہ میں دل کا مریض ہوں، حسب ضرورت ناشتہ کرچکا ہوں۔ لہٰذا اب کچھ نہیں کھاؤں پیئوں گا۔

بہرحال یہ میری آپ سے آخری ملاقات تھی، اے کاش! معلوم ہوتا کہ یہ آخری ملاقات ہے تو اسے اور طول دے دیتا یا ان سے اور ملاقاتیں کرلیتا۔

بہرحال اسی دل کے آپریشن کے دوران آپ کی روح اسلام آباد کے ایک ہسپتال میں قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ فیصل مسجد اسلام آباد میں جلد ہی نماز جنازہ ادا کیے جانے کے بعد آپ کی میت کو فوری طور پر شیخوپورہ لے جایا گیا اور یہ سب کچھ اس طرح آناً فاناً ہوا کہ اس عاجز سمیت آپ کے بہت سے دوستوں اور احباب کو آپ کے انتقال اور نماز جنازہ کا بروقت علم ہی نہ ہوسکا۔

اللہ تعالیٰ انھیں اعلیٰ علیین میں بلند وبالا درجات سے سرفراز فرمائے اور ان کے تمام لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق بخشے، آمین......!



سفیر اہل حدیث...... پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ

ابوعمر سوہدروی

ذرا تقسیم پاکستان سے پہلے اور موجودہ شواہد وواقعات کے تناظر میں دیکھیں تو حقیقت بالکل عیاں اور صاف ہوجائے گی کہ ہر دور میں اہل حدیث مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوا ہے اور حدیث وسنت کا علم پھیلتا رہا ہے۔ تقسیم پاکستان کے بعد اس اسلامی خطے میں اہل حدیث مسلمانوں کی تعداد سینکڑوں کی تعداد میں تھی اب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور حدیث وسنت کی برکت سے پورے پاکستان میں اہل حدیثوں کی تعداد لاکھوں کروڑوں تک جا پہنچی ہے۔ یہ سب اہل حدیث کے سفیروں کی محنتوں کا ثمر ہے جنھوں نے پاکستان میں اور پاکستان سے باہر دیگر ملکوں میں قرآن وحدیث کی اشاعت اور اس کی دعوت تبلیغ میں ہر میدان میں اپنا علم وعمل دکھایا اور تحریر وتقریر سے قرآن وسنت کی روشنی پھیلائی۔

انہی اہل حدیث سفیروں میں ایک نام جو ہمیشہ دنیائے اسلام کے عظیم اہل علم ودانش علمائے کرام میں زیر بحث رہے گا۔ پوری دنیا کے مسلمان ان کو پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ کے نام سے جانتے اور پہنچانتے ہیں۔ آپ ہمہ گیر اور ہمہ جہت خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے انتقال کے تین چار دن پہلے راقم کی بذریعہ موبائل ان سے ایک مضمون کے سلسلہ میں گفتگو ہوئی، جس کے بارے انھوں نے فرمایا کہ ''میں نے اس کا خاکہ بنالیا ہے ان شاءاللہ چند دنوں میں اس کی تفصیل لکھ کر بھجوادوں گا۔''

راقم عرصہ چھ سال سے ان کو جانتا ہے۔ چند ملاقاتیں اور چند دروس سماعت کیے جن سے بے حد علمی اور روحانی فیض حاصل ہوا۔ ان سے گزری ہوئی ملاقاتیں راقم کے لیے کسی قیمتی سرمایے سے کم نہیں۔ آپ سے کی ہوئی ملاقاتوں میں جو علمی خزانہ حاصل ہوا وہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے پروفیسر شاکر رحمہ اللہ صاحب کے شاندار علمی نظریات اور مختلف افکار کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ آپ کس پائے کے مذہبی سکالر تھے۔

۴ر ربیع الاوّل ۱۴۲۵ھ بمطابق ۲۶ر اپریل ۲۰۰۴ء کو ان سے پہلی ملاقات ان کے کتب خانہ ''بیت الحکمت'' لاہور میں ہوئی۔ راقم کے ساتھ جماعت کے مشہور مؤرخ مولانا عبدالرشید عراقی حفظہ اللہ بھی تھے۔ چائے کے بعد ہم تینوں کی آپس میں رسمی اور غیر رسمی گفتگو کا آغاز ہوا۔ شاکر صاحب رحمہ اللہ کے استفسار پر عراقی صاحب نے راقم کا تعارف کروایا۔ دورانِ گفتگو آپ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اردو زبان میں لکھی گئی سیرت کی کتب میں سے ''رحمۃ للعالمین'' سے بڑھ کر بہتر کتاب کوئی نہیں۔ پھر انھوں نے ایک واقعہ سنایا کہ ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے جو دس گیارہ جلدوں میں سیرت پر کتاب لکھی ہے وہ کتاب انھوں نے مجھے بھی بھجوائی۔ میں نے کتاب کا سرسری جائزہ لیا اور چند واقعات کا تقابلی مطالعہ کیا تو پتا چلا ان میں سنگین غلطیاں ہیں اور بہت تضادات ہیں۔ میں نے وہ تضادات نوٹ کر لیے اور ایک دن کسی مجلس میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوگئی تو میں نے تفصیل ڈاکٹر صاحب کو بتائی وہ آگے سے کہنے لگے بچوں نے حوالے لگائے ہیں ان سے غلطی ہوگئی۔ آپ ہمارے پاس آئیں اور کچھ وقت دیں ہم آپ کو معقول معاوضہ دیں گے۔ میں نے کہا میرے پاس وقت نہیں ہوتا اور ویسے بھی آپ میرا معاوضہ ادا نہیں کرسکیں گے۔''

پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ عربی، انگریزی، فارسی، اردو اور پنجابی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ حدیث وتفسیر اور فقہ کے ساتھ تاریخ میں انتہائی گہرا مطالعہ تھا۔ دنیا کے کئی ممالک میں سرکاری اور غیر سرکاری دورے کر چکے تھے۔

گفتگو میں تھوڑی سی بے تکلفی پیدا ہونے سے میں نے چند سوالات پوچھے جن کے انھوں نے نہایت مفصل و مدلل جوابات دیئے۔ اس سے مزید معلوم ہوا کہ احکام و مسائل پر بھی آپ رحمہ اللہ کی خوب نظر ہے۔ ان مسائل کا مختصر خلاصہ حوالہ قرطاس ہے:

① ...... تین دن کا سوگ ثابت نہیں یہ رسم ہندو کلچر سے متاثر ہو کر رائج کی گئی ہے۔ حدیث جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے اس کا استدلال باطل ہے۔

② ...... قسطوں پر لین دین ایک ہی قیمت اور مدت کا تعین کر کے کرنا جائز ہے۔

③ ...... گرامر کی کتابوں میں ''زید، بکر، عمر کے نام کی مثالیں رافضی سازش ہے۔

④ ...... متشابہ آیات کی صحیح تعداد واضح نہیں، جتنا قرآن وسنت سے ثابت ہے اسی پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ کیوں کہ اللہ کی صفات فہم و عقل سے بالاتر ہیں اگر وہ عقل میں آ جائیں تو خالق اور مخلوق میں فرق نہیں رہتا۔

⑤ ...... ذات کا وسیلہ مکروہات میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے اس کی صفات کا وسیلہ اصل زینہ ہے۔ کیوں کہ عقیدہ پڑھنے سے عقیدہ پختہ نہیں ہوتا بلکہ عمل کرنے سے، عقیدہ کا تعلق عمل ہے۔ توحید بہت اعلیٰ چیز ہے اور شرک میں تو اہل حدیث بھی پھنسے ہوئے ہیں۔ مثلاً شرک فی المعیشت اور شرک فی السیاست وغیرہ۔

⑥ ...... مسائل کو سمجھنے کے لیے اصل بات تطبیق ہوتی ہے۔

⑦ ...... خلافت و امامت کا مفہوم ایک ہی ہے۔ صرف ناموں کی وضاحت الگ الگ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حکومت منہاج علی النبوۃ ہونی چاہیے۔ چاہے وہ بذریعہ بادشاہت ہو یا ملوکیت۔

اس سوال پر شاکر صاحب رحمہ اللہ نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا، انھوں نے کہا:

''ایک دفعہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے کسی مجلس میں مجھ سے کہا کہ آپ تو سمع و اطاعت کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ آپ میری جماعت میں آ جائیں اور میری بیعت کر لیں۔ یہ سن کر شاکر صاحب رحمہ اللہ فرمانے لگے کہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے آپ کی بیعت کرنی چاہیے یا آپ کو میری بیعت کرنے کی ضرورت ہے۔

⑧ ...... کاتبانِ وحی کی تعداد اکیاون ہے۔ چالیس کاتبانِ وحی کا حوالہ ویسے ہی مشہور ہے۔

⑨ ...... یہودی اب بھی خیبر کا نام لے کر روتے ہیں۔

⑩ ...... سیرت النبی ﷺ پر مختلف زبانوں میں جو کتابیں لکھی جا چکی ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

- عربی زبان میں پانچ ہزار سے زائد
- اُردو زبان میں تین ہزار سے زائد
- انگریزی زبان میں دو ہزار سے زائد
- فارسی زبان میں پانچ صد سے زائد

شاکر صاحب رحمہ اللہ کے اپنے کتب خانے میں تقریباً پانچ ہزار کے لگ بھگ سیرت النبی ﷺ پر کتب موجود ہیں۔ ان کے شوق کا یہ انداز تھا کہ ہر اتوار انارکلی بازار سے ایک ہزار کی پرانی اور نایاب کتب تلاش کر کے خریدتے۔

میرے سوالات ختم ہونے پر شاکر صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ گارڈن ٹاؤن میں علامہ اقبال رحمہ اللہ کے بارے میں میرا لیکچر ہے، میں نے فوراً کہا

اگر آپ برا نہ مانیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔ شاکر صاحب رحمہ اللہ سن کر بہت خوش ہوئے اور فوراً ہمیں ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ یاد رہے شاکر صاحب رحمہ اللہ کو اقبال رحمہ اللہ کے کلام پر بڑا عبور حاصل تھا۔ آپ نے اقبالیات میں ایم۔فل بھی کیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک گاڑی آ گئی۔ ہم دونوں ان کے ساتھ چلے گئے۔ اس پروگرام میں شاکر صاحب رحمہ اللہ کو جو عنوان دیا گیا اس کا نام تھا: ''امت مسلمہ کا المیہ''

اس خطاب کے مختصر اقتباسات ملاحظہ کیجیے

① ......ہمیں لوگوں کے اندر فکر مجدد الف ثانی، فکر شاہ ولی اللہ و فکر علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ پیدا کرنی چاہیے تاکہ مسلمانوں کے جمود میں ارتعاش پیدا ہو۔

② ......عقیدہ و ثقافت کی مضبوطی کے لیے تمدن کا پیدا ہونا ضروری ہے اور اس کے لیے ریاست کا ہونا اشد لازمی ہے۔

③ ......عقیدہ توحید تو آج کل علم الکلام بن چکا ہے اقبال رحمہ اللہ نے بھی کہا تھا:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی   آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علم کلام

④ ......مغربی تہذیب جتنی بھی ترقی یافتہ ہو وہ مشرقی تہذیب کے ہر رنگ گھس چکی ہے۔ تاریخ انسانیت میں تہذیبوں کے اوراق بکھرے ہوئے ہیں۔

⑤ ......اقبال رحمہ اللہ جدت کے خلاف نہیں تھے لیکن مغربیت کے خلاف ضرور تھے۔

⑥ ......مغرب نے مادی ترقی کے لیے انتہا پر پہنچ کر تہذیب کی طرف دیکھا۔

⑦ ......مغربی تہذیب کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے خاندانی نظام کو توڑ کر رکھ دیا۔

⑧ ......تہذیبیں ملکوں کو جنم دیتی ہیں۔

⑨ ......اقبال رحمہ اللہ کی فکری جغرافیات عالمگیر حیثیت رکھتی ہے۔

⑩ ......آج کل ملکوں کا ٹکراؤ نہیں تہذیبوں کا ٹکراؤ ہو رہا ہے۔

⑪ ......افسوس ہم نے اقبال رحمہ اللہ کے کلام کو صحیح سمجھا نہیں، اداروں نے تو اقبال رحمہ اللہ کے کلام کو گلوکاروں اور موسیقاروں کے حوالہ کر دیا ہے۔

۱۶ ستمبر ۲۰۰۴ء بروز جمعرات جامعہ الدعوۃ الاسلامیہ مرید کے میں تقریب بخاری کے موقع پر ''عصر حاضر میں علماء کی ذمہ داریاں'' کے عنوان کے تحت بہت پر جوش خطاب ہوا جس کے اقتباسات ہمارے لیے اسباق ہیں:

① ......اسلامی تہذیب پر عجمی افکار کے اثرات اور اس کے ساتھ ساتھ یونانی فلسفہ و منطق اور تصوف کے اثرات نے مسلمانوں کو گمراہ کیا۔

② ......خراسانی کبیر کی روایات کے اثرات نے بعض مفسرین نے قرآن ایک بازیچہ اطفال بنا دیا۔

③ ......اکثر علماء کو بخاری کے ابواب تراجم کا ادراک حاصل نہیں ہوتا۔

④ ......ابن خلدون نے کہا تھا کہ بخاری کی شرح کا قرض امت پر ابھی باقی ہے۔

⑤ ......تدریس کے ساتھ علماء کا اصل کلام تزکیہ نفس کرنا ہے۔

⑥ ...... ماضی کی تمام ثقافت کی حدیں آج پار ہو چکی ہیں۔

⑦ ......۱۸۵۴ء میں پیدا ہونے والا بہائی مذہب آٹھ سو زبانوں میں ملتا ہے۔

⑧ ...... ہندوستان میں بخاری شریف کا ہندی زبان میں ترجمہ ہوا۔

⑨...... ہندوستان میں اہل حدیث کی تعداد چار کروڑ سے زائد ہے۔
⑩...... بائبل کا ترجمہ چار سو زبانوں میں ملتا ہے۔ جب کہ قرآن ایک سو سے زائد تراجموں میں نہیں ملتا۔
⑪...... بخاری شریف ابواب کے ذریعہ اصول معیشت کا عملی نفاذ ممکن ہے۔
⑫...... پہلے کچی مسجدوں میں پکے نمازی تھے لیکن آج پکی مسجدوں میں کچے نمازی ہیں۔
⑬...... اگر انسانوں کی تجارت جائز ہوتی تو میں اپنے آپ کو پیش کرتا کہ مجھے خرید کر شیخ الکل سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کی ساٹھ سالہ محنت کے صلہ میں ایک ساٹھ منزلہ عمارت تعمیر کی جاتی۔
⑭...... انٹرنیٹ پر تین تین گھنٹے کے لیے دارالفتاویٰ قائم کیا جائے۔
⑮...... قرآن وحدیث پڑھانے والوں کا خود بھی ایمان پختہ نہیں۔
⑯...... تسخیر کائنات ہمارا اصل مقصود نہیں۔
⑰...... شیطان مساجد اور مدارس کی کثرت سے پریشان نہیں وہ مسلمانوں میں مسنون زندگی پیدا ہونے سے پریشان ہے۔

۷ دسمبر ۲۰۰۴ء کو امام بخاری رحمہ اللہ یونیورسٹی موترہ سیالکوٹ میں تقریب صحاح ستہ پر جناب شاکر صاحب رحمہ اللہ کے ''علم اور علماء'' کے موضوع پر ایک شاندار خطاب کی تحریری جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے:

①...... شریعت علم کا ذخیرہ ہے اور اس میں جو بات بھی بتائی گئی ہے وہ تا قیامت بغیر تبدیلی کے وہی رہے گی مثلاً قرآن وسنت کی باتیں۔
②...... دین اسلام علم کا بنیادی ذخیرہ ہے اور سائنس وٹیکنالوجی کا علم معلومات کا ذخیرہ ہے۔ کیوں کہ سائنس میں اسی علم کی بنیاد پر معلومات بدلتی رہتی ہیں۔
③...... آپ ﷺ کا فرمانِ عالی شان ہے کہ ''انما بعثت معلماً''، یعنی ''بے شک میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔'' اس لیے آپ ﷺ دنیا میں سب سے بڑے معلم ہیں اور معلم اوّل بھی ہیں۔
④...... جدید علوم کردار پیدا نہیں کرتے اور نہ تربیت کرتے ہیں۔
⑤...... کتاب وسنت کا علم بارہ زبانوں میں شائع ہو کر انٹرنیٹ پر نشر ہو رہا ہے۔

ان ملاقاتوں کے بعد بذریعہ فون آپ رحمہ اللہ سے بات ہوتی رہتی اور کسی درپیش مسئلہ کے لیے آپ رحمہ اللہ سے رابطہ بھی بذریعہ فون رہتا اور خیریت کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا۔

دنیائے اسلام کے اس بطل حریت اور عظیم سفیر سے آخری ملاقات ۲۴ رجب ۱۴۳۰ھ بمطابق ۱۸ جولائی ۲۰۰۹ء بروز ہفتہ ان کے سیرت سٹڈی سینٹر کے دفتر میں ہوئی۔ ملاقات کا مقصد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد علی جانباز رحمہ اللہ شارح ابن ماجہ عربی کی حیات وخدمات کے بارے شاکر صاحب کے تاثرات اور کتاب کے بارے مشورہ کرنا تھا۔ کیوں کہ راقم شیخ جانباز رحمہ اللہ پر ایک کتاب مرتب کر رہا ہے۔ ملاقات سے پہلے چائے اور سموسہ سے تواضع ہوئی۔ شاکر صاحب کو خود شیخ جانباز رحمہ اللہ سے بڑی عقیدت تھی۔ آپ جب بھی سیالکوٹ تشریف لاتے شیخ جانباز رحمہ اللہ سے ضرور شرف ملاقات حاصل کرتے۔ آپ رحمہ اللہ کو اہل قلم حضرات سے بڑی الفت تھی۔ خاص کر وہ اہل قلم جو حدیث اور اہل حدیث پر کام کرتے ہیں۔

سلام ودعا کے بعد میں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور ابتدائی سوالات پوچھے تو آپ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ سوالات سطحی سے ہیں۔ شیخ

جانباز رحمہ اللہ کا کام جس نوعیت کا تھا اور جس پائے کی وہ علمی شخصیت تھے اسی طرح کی کوئی چیز تحریر ہونی چاہیے تا کہ حدیث اور اہل حدیث کی عظمت وحقیقت واضح ہو۔آپ کے یہ کلمات سن کر میں نے اپنا تیار کردہ خاکہ ان کو پڑھ کر سنایا تو آپ نے فرمایا میں ان شاءاللہ آپ کو ایک جاندار شذرہ لکھ کر بھیجوں گا۔لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا۔آپ ۲۳ شوال بروز منگل بمطابق ۱۳/اکتوبر ۲۰۰۹ءکو دورانِ بائی پاس آپریشن ،اسلام آباد میں انتقال فرما گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ نے کتاب کے بارے چند موضوعات لکھوئے جو کتاب کی تدوین وترتیب میں بہت معاون ثابت ہوئے۔وہ عنوانات یہ ہیں:

①...... برصغیر میں علم حدیث اور محدث جانباز رحمہ اللہ کا کردار

②......سیالکوٹ میں مسلک اہل حدیث تاریخی تناظر میں

③......سیالکوٹ میں علمائے اہل حدیث کی علمی خدمات

④......محدث جانباز رحمہ اللہ حیات وخدمات کے آئینے میں

شخصیت وکردار:

آپ بین الاقوامی شخصیت تھے اور ایک عبقری انسان تھے۔وہ بہت سی شاندار اور جاندار خوبیوں کے مالک تھے۔نہایت صاف گو تھے۔ان کی گفتگو میں سنجیدگی ومتانت جھلکتی تھی۔ان کے الفاظ میں بہت گہرائی اور علمی وسعت پائی جاتی تھی۔آپ کا حافظہ بہت قوی تھا۔ایک دفعہ اسلامی یونیورسٹی کی بک شاپ پر ان سے اچانک ملاقات ہوئی، میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور ہاتھ ملایا۔آپ نے پرجوش انداز میں خریت دریافت کی۔میں نے عرض کیا،شاکر صاحب آپ نے پہچانا تو آپ نے فوراً فرمایا:

''جی ہاں میں نے آپ کو پہچان لیا ہے آپ عراقی صاحب کے گاؤں سے آئے ہیں ان کے ساتھ آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔''

آپ بے داغ کردار کے آئینہ دار تھے۔ان کے پاس اکثر طلباء وطالبات ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے مقالوں کے لیے آتے رہتے تھے۔آپ کسی اکیلی خاتون سے نہیں ملتے تھے جب تک کوئی مرد اس کے ساتھ نہ ہوتا۔

ایک دفعہ کسی طالبہ نے فون پر وقت لیا تو آپ نے فرمایا:''ساتھ کسی مرد کو ضرور لے کر آئیں ورنہ کتب خانے کا دروازہ نہیں کھلے گا۔''

دینی وعلمی خدمات:

یوں تو آپ نے ملک میں اور ملک سے باہر لاتعداد لیکچرز اور دروس ارشاد فرمائے اور ہزاروں کی تعداد میں کتابوں کے مقدمات، پیش لفظ اور تقریظات اور فلیپس احاطہ تحریر میں کیے لیکن اسی بے پناہ گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے باقاعدہ کوئی کتاب مرتب نہ کر سکے۔البتہ ان کے مقالات کی کئی جلدیں تیار ہوسکتی ہیں۔سیرت کے عنوان پر آپ نے دس گیارہ کتابوں کا تقابل شروع کیا تھا وہ کام کہاں تک پہنچا، یہ معلوم نہیں۔بے شمار رسائل وجرائد میں آپ کے تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔

آپ بے پناہ علم ووسعت اور کتاب دوست تھے۔اہل علم اور اہل قلم حضرات کی خصوصی عزت کرتے تھے۔مولانا عبدالرشید عراقی حفظہ اللہ کے ساتھ بڑے زبردست مراسم تھے۔آپ ان کو اپنے کتب خانے سے کتابیں مستعار دے دیتے اور ان کا ریکارڈ بھی نہ رکھتے۔آپ جیسی نفیس اور جامع الکمالات شخصیت ڈھونڈنے سے ملتی ہے۔

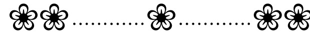
صاف شفاف روحانی اور باطنی اوصاف کے مالک تو آپ تھے ہی لیکن ظاہری اوصاف میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔یعنی ظاہر اور باطن ہمیشہ

یکساں نظر آ تا تھا۔صاف ستھرا سفید رنگ، مناسب جاذبِ نظر قد کاٹھ، سر اور ڈاڑھی کے بال مکمل سفید، سر پر جناح کیپ خوب صورت ریش کے ساتھ خوب جچتی تھی۔سادہ لباس زیب تن کرتے، اکثر شلوار قمیص پہنا کرتے تھے۔

آپ کو اپنے اسلاف سے بے حد محبت تھی اس کا اندازہ ان ناموں سے لگائیں جو آپ نے اپنے چھ بیٹوں کے رکھے ہوئے ہیں۔ذرا ایک جھلک دیکھیں......!

محترم جمال الدین افغانی ﷾،محترم صلاح الدین ایوبی ﷾،محترم کبیر الدین رازی ﷾،محترم جلال الدین رومی ﷾،محترم رفیع الدین حجازی ﷾،محترم نجم الدین فارانی ﷾۔

اللہ تعالیٰ آپ کے ڈھیروں درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کی اولاد کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، آمین......!

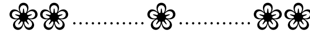


حافظ محمد ایوب خالد کو صدمہ

حافظ محمد ایوب خالد (مہتمم جامعہ عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ اہل حدیث، منڈی جھبراں) کی والدہ محترمہ ۲۶ دسمبر ۲۰۰۹ء بروز ہفتہ وفات پا گئیں۔انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحومہ بڑی صالحہ و نیک سیرت خاتون تھیں۔مہمان نواز اور دینی کاموں میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ان کی نماز جنازہ میں گوجراں والا، شیخوپورہ اور گردونواح سے علمائے کرام، طلبائے مدارس دینیہ اور عزیز و اقارب نے شرکت فرمائی۔ قارئین سے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

حافظ محمد ایوب صاحب سے تعزیت کرنے کے لیے ان کا نمبر 0300-8878629 ہے۔ [محمد سلیم چنیوٹی]



آل پاکستان اہل حدیث کانفرنس

ماموں کانجن

جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کے زیر اہتمام آل پاکستان اہل حدیث کانفرنس ۲۵، ۲۶ مارچ ۲۰۱۰ء بروز جمعرات وجمعۃ المبارک منعقد ہوگی۔ان شاء اللہ

تفصیلی اشتہار بعد میں دیا جائے گا۔

[(مولانا) عبدالقادر ندوی، خادم جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن، ضلع فیصل آباد]

پروفیسر عبدالجبار شاکر

عبدالرشید عراقی

۱۳/اکتوبر ۲۰۰۹ء ۱۲/۱۲ بجے دوپہر برادرم حکیم راحت نسیم صاحب کو ایک ضروری کام کے سلسلہ میں ٹیلی فون کیا۔ تو انھوں نے یہ اندوہناک خبر سنائی کہ پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

آہ! کس طرح انھیں مرحوم لکھوں جو زندگی سے بھرپور تھے۔ جنھوں نے اسلام اور ملت اسلامیہ کی صلاح وفلاح کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔

شاکر صاحب سے میرا تعارف تقریباً ۲۰۰۵ء سے تھا۔ ان کی زندگی گونا گوں مشاغل سے معمور تھی۔ ان کا شمار اُن علماء میں ہوتا تھا جو اپنے علم وفضل اور کتاب دوستی کی وجہ سے اہل علم واہل قلم کے حلقہ میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ وہ بڑے خوش بیان مقرر تھے۔ علومِ اسلامیہ یعنی تفسیر، حدیث اور تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ سیاسیات حاضرہ پر بڑے مثبت انداز میں تبصرہ فرماتے تھے۔

وہ خود تو کتابوں کے مصنف نہیں ہوئے۔ مگر انھوں نے سینکڑوں کتابوں پر مقدمات، تعارف اور تقریظات لکھیں۔ ان کی ان تحریروں سے ان کے ذوق مطالعہ، وسعت معلومات اور تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر کی ذات تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور ایک عہد تھے۔ ان کی ذات میں پورے ایک عہد کا خلاصہ جمع ہو گیا تھا۔ اور ان کی شخصیت بڑی متوازن ہو گئی تھی۔ ان کی رائے بڑی دقیع اور باوزن ہوا کرتی تھی۔ شاکر صاحب کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ ان سبھوں کو اجاگر کرنا تو مستقل کتاب کا موضوع ہو سکتا ہے۔ وہ ایک عالم دین، ایک مفکر اور ایک دانشور وخطیب ومقرر ہونے کی حیثیت سے ایک پوری دنیا اپنے اندر بسائے ہوئے تھے۔ ان کی ایک عجیب ادا ان کی بے انتہا تواضع تھی۔ ان کی شخصیت کا بڑا کمال یہ تھا کہ ان کے یہاں اپنے اور غیر کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ ساری دنیا ان کی اپنی تھی غیر کوئی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جتنا زرخیز دماغ، جیسی دور اندیشی اور حکمت بولنے اور لکھنے کی جیسی صلاحیت اور لوگوں میں جس طرح کی مقبولیت دی تھی اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

پروفیسر صاحب خداداد ذہانت اور اعلیٰ صلاحیت کے مالک تھے۔ طبیعت میں اعتدال، رائے میں توازن، فکر میں گہرائی، اور معاملات میں دور اندیشی آپ کا طرۂ امتیاز تھی۔ پروفیسر صاحب اپنی وضع کے پابند، اخلاق وشرافت کا مجسمہ اور علم وعمل کا پیکر تھے۔ ان کی وفات سے دینی قیادت اور خاصکر جماعت اہل حدیث کو جو عظیم زخم لگا ہے اور عظیم خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور ایسی شخصیت کا پانا صدیوں تک محال ومشکل ہوگا۔ پروفیسر حکیم راحت نسیم نے جب راقم کو ان کی وفات کی خبر سنائی تو کہا:

عراقی صاحب! پروفیسر عبدالجبار شاکر کی شخصیت اس قدر ہمہ گیر اور ہمہ صفت ہے جس کی مثال شاید اس زمانے میں ناپید ہے۔ آپ ایک شب زندہ دار بزرگ بھی تھے اور عالم باعمل بھی۔ آپ ایک سحر بیاں مقرر بھی تھے اور بے مثال اہل قلم بھی۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی دینی فہم بھی عطا کی تھی اور دنیاوی شعور بھی۔ آپ پاکیزہ اخلاق کے مجسمہ تھے۔ تواضع اور مہمان نوازی میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ جب بھی ان سے ملاقات کے لیے ان کی رہائش بیت الحکمت (ملتان روڈ لاہور) حاضر ہوتا تو بڑی محبت سے ملتے۔ تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ مختلف موضوعات پر ان سے

گفتگو ہوتی۔ حالات حاضرہ پر بڑے مثبت انداز میں تبصرہ فرماتے۔ کتاب دوستی میں ان کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ ان کی لائبریری میں ہزاروں کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ سیرت نبوی ﷺ پر ان کی لائبریری میں تین ہزار سے متجاوز کتابیں ہیں۔ ان کے علمی تبحر، ذوق مطالعہ اور وسعت معلومات کا ملک کے نامور اہل علم اور اہل قلم نے اعتراف کیا ہے اور دوسرے مکاتب فکر کے علماء اور اہل قلم ان کی صداقت شعاری کی وجہ سے ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔

کتابوں کے بارے میں ان کی وسعت معلومات کا یہ حال تھا کہ راقم ایک دن ان سے ملاقات کے لیے بیت الحکمت میں حاضر ہوا۔ تو دوران گفتگو راقم نے مولانا حکیم سید عبدالحیٔ الحسنی (والد ماجد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) کی کتاب یادایام کا ذکر کیا تو پروفیسر صاحب نے مجھے فرمایا:

عراقی صاحب! یادایام کے نام سے پندرہ کتابیں لکھی گئی ہیں جس میں دس کتابیں میری لائبریری میں موجود ہیں اور پانچ کی تلاش جاری ہے۔ اوراس وقت پروفیسر صاحب نے دس کی دس کتابیں لاکر راقم کو دکھائیں۔

پروفیسر صاحب میں سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اہل علم کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور بڑی فراخ دلی سے اس کے علم وفضل کا اعتراف کرتے تھے۔ راقم نے ایک ملاقات میں ان سے علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کے بارے میں دریافت کیا تو پروفیسر صاحب نے فرمایا:

عراقی صاحب! سید کو دیکھا نہیں پڑھا ضرور ہے۔ ان کے علمی تبحر، ذوق مطالعہ اور وسعت معلومات سے انکار نہیں۔ وہ ایک بلند پایہ محقق، مؤرخ، ادیب، نقاد اور مبصر تھے۔ ان کی تصانیف میں سیرت النبی، خطبات مدراس، سیرت عائشہ اور خیام بڑی معرکۃ الآراء کتابیں ہیں۔

ایک ملاقات میں مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کے بارے میں دریافت کیا تو پروفیسر صاحب نے فرمایا:

عراقی صاحب! مولانا عطاء اللہ حنیف جیسا محقق اور صاحب بصیرت عالم جماعت اہل حدیث میں پیدا نہیں ہوا۔ آپ علوم اسلامیہ کے متبحر عالم تھے۔ حدیث اور متعلقات حدیث پر آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن قیم کی تصانیف کے بہت شیدائی تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے دلی عقیدت رکھتے تھے۔ اور کتاب دوستی میں ان کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ ان کی لائبریری میں نایاب کتب کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ اخلاق وعادات کے اعتبار سے اوصافِ حمیدہ کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی بال بال مغفرت فرمائے۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر قدرت کی طرف سے بڑے اچھے دل ودماغ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ روشن فکر، دردمند دل اور سلجھا ہوا دماغ پایا تھا۔ ذہن وذکاوت کے ساتھ قوت حافظہ بھی بہت قوی تھا۔ ٹھوس اور قیمتی مطالعہ ان کا سرمایہ علم تھا۔ تاریخ پر گہری اور تنقیدی نظر رکھتے تھے۔ ملکی سیاسیات سے نہ صرف یہ کہ باخبر تھے بلکہ اس پر اپنی ناقدانہ رائے بھی رکھتے تھے۔ برصغیر کی دینی، علمی، قومی وملی اور سیاسی تحریکات کے قیام کے پس منظر سے بخوبی واقف تھے۔

پروفیسر صاحب کی عصری تعلیم ایم اے ایل ایل بی تھی۔ مدتوں پبلک لائبریریز پنجاب کے ڈائریکٹر رہے۔ آج کل دعوت اکیڈمی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ڈائریکٹر اور فیصل مسجد اسلام آباد کے خطیب تھے۔

وہ اب وہاں ہیں جہاں ایک روز سب کو جانا ہے مگر جن لوگوں کو ان کے ساتھ کام کرنے یا ان سے ملنے جلنے کا موقع ملا وہ ان کی شرافت، مرنجاں مرنج انداز طبع، اختلاف کے موقع پر شریفانہ برتاؤ دیکھ کر دل سے دعائیں کریں گے کہ ان کی زندگی کے روشن کارنامے اُن کے لیے توشۂ آخرت بنیں گے اور وہ بارگاہِ ایزدی میں کہہ رہے ہوں گے:

ربّ اغفر وارحم وانت خير الراحمين۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ

حافظ ریاض احمد عاقب، ملتان

اس جہاں رنگ وبو میں فانی انسان کی آمد ورفت کا سلسلہ انسان اوّل سیدنا آدم علیہ السلام سے جاری وساری ہے۔ اور قیامت تک جاری رہے گا۔ بڑی بڑی شہرہ آفاق ہستیاں، عبقری رجال اس دار فانی سے دارِ بقاء کی طرف کوچ کر چکے ہیں۔ یہ دنیا ایسی ہی ہے کہ جس طرح ایک عربی شاعر نے کہا ہے:

نَزَلْنَا هٰهُنَا ثُمَّ ارْتَحَلْنَا　　　كَذَا الدُّنْيَا نُزُوْلٌ وَّارْتِحَالٌ

''ہم یہاں اترے پھر کوچ کر گئے اسی طرح دنیا بھی اترنے (ٹھہرنے) اور کوچ کرنے کا نام ہے۔''

اس دنیا فانی میں آتے تو سبھی جانے کے لیے ہیں مگر کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو جانے کو اس عالم فانی سے گزر جاتے ہیں مگر اپنے پیچھے ایک کنبہ وقبیلہ اور اہل وعیال ہی نہیں ایک جہانِ غمزدہ چھوڑ جاتے ہیں۔ بقول شاعر

بچھڑا اِس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

ایسے ہی لوگوں میں ایک ہمارے ممدوح، ممتاز مذہبی سکالر، ماہر اقبالیات، جید عالم دین، بلند پایہ محقق اور منفرد اُسلوب نگارش کے مالک پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ تھے جو عارضہ قلب میں مبتلا تھے اور بائی پاس آپریشن کے سلسلے میں اسلام آباد کی مقامی ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ جہاں وہ دورانِ آپریشن اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے۔

ہو گئے محروم ہم اس گوہر نایاب سے
ہو گیا خالی شبستان آہ اس مہتاب سے
سسکیاں سی اٹھ رہی ہیں منبر و محراب سے
جیسے مجبوراً بچھڑ جائے کوئی احباب سے

پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ نے اپنی زندگی کی ۶۲ بہاریں دیکھیں۔ آپ ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ پروفیسر موصوف نے علوم درس نظامی، لاگریجوایٹ اور اقبالیات میں ایم فل کر رکھی تھی۔ آپ اردو ادب کے پروفیسر تھے۔

پروفیسر موصوف نے مختلف کالجز میں تدریس خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ تقریر وتحریر میں اپنا نام پیدا کیا۔ کافی عرصہ آپ پبلک لائبریریز کے ڈی جی مقرر رہے۔ موصوف نے درجنوں کتابوں کے مقدمے اور دیباچے تحریر کیے۔ بے شمار ٹی وی پروگراموں میں شریک رہے۔ لاہور میں قیام کے دوران آپ نے منصورہ کے بالمقابل ''بیت الحکمت'' کے نام سے وسیع وعریض لائبریری قائم کی جس کا شمار پاکستان کی چند منفرد لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ سیرت، اقبالیات، تقابل ادیان، قانون، علوم اسلامیہ وعربیہ، قرآن، حدیث، فارسی ادب اور عربی لٹریچر کی ہزاروں

کتابیں، نایاب مخطوطات اور درجنوں مقالات اس لائبریری کی زینت ہیں۔ اسلام آباد میں پروفیسر موصوف انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں بطور ڈائریکٹر سیرت چیئر اور فیصل مسجد میں بطور خطیب خدمات انجام دے رہے تھے۔ اور ساتھ ساتھ ٹی وی کے مختلف پروگراموں میں شرکت کرتے رہے اور اپنے علمی و دینی محاضرات سے لوگوں کو مستفید کرتے رہے۔

موصوف ادبیات، لسانیات، شہریات، لفظیات اور اقبالیات کے شہسوار تھے۔ بطور ادیب، خطیب، محقق و مدقق ان کی علمی چابک دستی اور بصیرت اعلیٰ درجے کی تھی۔

راقم السطور کی آپ سے ملاقات ۲۰۰۳ء کو جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں ''تقریب بخاری'' کے موقع پر ہوئی جب راقم مرکز التربیۃ الاسلامیۃ فیصل آباد میں زیر تعلیم تھا۔ راقم الحروف اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ کا خطاب سننے آیا، تو آپ کو بہت اچھا خطیب اور مایہ ناز مقرر پایا۔ پروفیسر موصوف جب اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے، علمی تجربات و نکات بیان کرتے تو ان کی جادو بھری پرتاثیر آواز سامعین حضرات پر سحر طاری کر دیتی اور سامعین کرام حیرت و استعجاب سے ان کے کٹھن تجربے، پر مغز دلائل اور علمی نکات سن کر کبھی ان کی شخصیت اور کبھی ان کے سفید بالوں کو دیکھتے رہ جاتے۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ قدیم اسلاف کا عملی نمونہ تھے۔ موصوف وسیع المطالعہ شخص تھے، تحقیق و تدقیق کا معتبر حوالہ تھے۔ آپ جذب صادق اور حق کا اظہار واشگاف الفاظ میں بیان کرتے ہوئے ادب، تاریخ، قرآن و حدیث اور دیگر دوسرے علوم و فنون پر گھنٹوں گفتگو کرتے۔ تحریر و تقریر، بحث و مباحثہ اور مذاکرہ میں اتنے ٹھوس دلائل دیتے کہ حاضرین محفل ششدر رہ جاتے۔ آپ جس محفل میں تشریف لے جاتے، تمام سامعین انھیں سننے کے لیے خاموش ہو جاتے۔

قوتِ حافظہ اور یادداشت حیران کن تھی۔ علم و ادب کا مطالعہ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ بلاشبہ موصوف اپنے عہد کے عظیم انسان تھے۔ استادوں کے استاد تھے اور بڑے فاضل حضرات بھی ان کی محفل میں جا کر اپنی علمی تشنگی دور کرتے۔ وہ اکثر موضوعات پر گھنٹوں گفتگو کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ سیر حاصل گفتگو کے ساتھ بھرپور اور ٹھوس دلائل سے حاضرین محفل کی آبیاری کرتے۔ موصوف دین اسلام، محمد مصطفیٰ ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اپنے اسلاف سے سچی محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ جب ان کی زندگیاں اور کارہائے نمایاں بیان کرتے تو حاضرین محفل عش عش کر اٹھتے۔

پروفیسر موصوف کی اقبال شناسی اور اقبال فہمی بھی قابل ذکر ہے۔ آپ اقبال کی شاعری کے محاسن گنواتے وقت ان کی شعری ہیئت، رنگ تغزل اور مخصوص اُسلوب کو بھرپور انداز میں خراجِ عقیدت پیش کرتے تھے۔ آپ نے اقبال کی انفرادیت، عظمت اور اسلوب کی انفرادیت کو بڑے تحقیقی انداز میں برتر اور اعلیٰ ثابت کیا ہے۔ آپ نے اقبال کی اہمیت اور فضیلت کسی عقیدت کی بناء پر نہیں بلکہ خالصتاً نظریاتی اور فنی انداز میں ثابت کی۔ موصوف دوقومی نظریہ کے پرزور حامی تھے۔ پروفیسر موصوف تقریر و خطابت کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منفرد اسلوبِ نگارش کے مالک بھی تھے۔ درجنوں کتب کے مقدمات اور دیباچے اس بات کے شاہد ہیں کہ موصوف کا اندازِ تحریر جاذب، رواں دواں اور ادیبانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پروفیسر موصوف کو ایک ایسا اسلوبِ نگارش عطا کیا ہوا تھا، جو اردو زبان و ادب کے اسالیب میں انفرادیت کا حامل تھا۔ آپ کے اندازِ تحریر اور اُسلوب نگارش کو دیکھ کر آپ کی وسعت نظری کا اندازہ ہوتا ہے۔ الغرض پروفیسر موصوف کی علمی، ادبی اور دینی خدمات احاطۂ تحریر سے باہر ہیں۔

سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

علم وادب کا شیدائی، تحقیق وتاریخ کا رسیا، سیرت مصطفیٰ ﷺ کی اعلیٰ اقدار کا پاسبان، اقبالیات کا رمز شناس، عظیم عالم دین، جس نے نصف صدی لاہور کی علمی، ادبی اور ثقافتی محفلوں کی آبیاری کی اور علم وحکمت کے گلہائے رنگا رنگ نچھاور کیے۔ تحقیق وتدقیق کے میدان میں کوہ ندا کی خبر لایا، وہ پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ مدتوں اہل علم واہل قلم کو اپنے فکر سے فیض یاب کرتے رہیں گے۔ ان کی نگارشات لوگوں کو سچائی کا درس دیتی رہیں گی۔ موجودہ اور آنے والے اہل علم اور اہل قلم موصوف کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

ان کی وفات سے جماعتی وعلمی حلقہ میں ایک عظیم خلا پیدا ہوا ہے۔ ایسی باکمال شخصیت بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پروفیسر موصوف رحمہ اللہ کی سیرت اور کی علمی وادبی خدمات پر روشنی ڈالنا مجھ جیسے کم علم کا کام نہیں۔ ان کے ساتھ رہ کر ان کی سیرت وکردار اور خدمات کا ادراک ومشاہدہ کرنے والے اربابِ قلم اور اہل عقل ودانش اس موضوع پر مفصل روشنی ڈالیں گے۔ (ان شاء اللہ)

اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

ہم دعا گو ہیں کہ

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے



مفتی عبدالرحمٰن رحمانی کا انتقال پر ملال

جماعۃ الدعوۃ پاکستان کے دارالافتاء والقضاۃ کے سربراہ، حضرت مولانا مفتی عبدالرحمٰن رحمانی ۴ رمحرم الحرام ۱۴۳۱ھ بمطابق ۲۲ دسمبر ۲۰۰۹ء بروز منگل رات شدید علالت کے بعد وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مفتی صاحب مرحوم جماعۃ الدعوۃ کے بانی رہنما تھے۔ جماعۃ الدعوۃ کے شرعی امور کے سربراہ اور بعض دینی کتب کے مصنف تھے۔ انھوں نے لوگوں کے کئی مسائل کو اپنے فتاویٰ اور فیصلوں کے ذریعے حل کیا۔ ان کی نماز جنازہ محترم حافظ محمد سعید صاحب امیر جماعۃ الدعوۃ پاکستان نے ان کے آبائی شہر عبدالحکیم میں پڑھائی۔ جنازے میں کثیر احباب، علماء، طلباء اور دیگر حضرات نے شرکت فرمائی۔ قارئین الاعتصام مرحوم کی مغفرت وبلندئ درجات کے لیے دعا فرمائیں اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا فرمائیں۔

اراکین ادارہ الاعتصام مرحوم کے لیے دعائے مغفرت اور لواحقین سے تعزیت کا اظہار کرتے ہیں۔

اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه وادخله الجنة الفردوس، آمين

[محمد سلیم چنیوٹی]

ایک یادگار سفر

محمد سلیم چنیوٹی

راقم کے لیے ۳۱۔اکتوبر ۱۹۹۹ء بڑی سعادت کا دن تھا۔اس دن جماعت اہل حدیث کی مستجاب الدعوات ہستی جناب صوفی محمد عبداللہ رحمہ اللہ کی قائم کردہ دینی دانش گاہ جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن ضلع فیصل آباد میں ''الجامع الصحیح البخاری'' کی تقریب سعید منعقد کی جارہی تھی۔

جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن ضلع فیصل آباد کے رئیس مکرم حضرت مولانا عبدالقادر ندوی حفظہ اللہ نے اس تقریب کے خصوصی طور پر بذریعہ فون جناب حماد شاکر (مدیر شاکرین، لاہور) سے رابطہ کر کے ہدایت فرمائی کہ لاہور سے درج ذیل احباب کو اس تقریب میں بطور مقررین ضرور لایا جائے۔

① ...... مکرم ومحترم پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ صاحب ② ...... جناب مکرم مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ

③ ...... پروفیسر سعد صدیقی صاحب (پنجاب یونیورسٹی لاہور) ④ ...... جناب حافظ صلاح الدین یوسف صاحب حفظہ اللہ

⑤ ...... جناب علم الدین علیم ناصری صاحب (رحمہ اللہ)

ہمارے ممدوح مکرم جناب پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب و دوسرے احباب علم و دانش صبح دس بجے کے قریب مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ پر تشریف لے آئے تھے۔اسی مقام سے بذریعہ (ہائی ایس) روانگی ہوئی۔ماموں کانجن کی اس دانش گاہ میں بعد نماز ظہر تقریب بخاری شریف کا اہتمام تھا۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے ہماری گاڑی جامعہ تعلیم الاسلام کے گیٹ پر تھی۔وہاں پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب کی معیت میں تمام احباب سیدھے جامعہ کی مسجد میں پہنچے۔نماز ظہر کی باجماعت ادائیگی ہوئی۔جامعہ تعلیم الاسلام کے رئیس محترم مولانا عبدالقادر ندوی حفظہ اللہ بڑے تپاک سے ملے۔فرداً فرداً معانقہ فرمایا اور فرمانے لگے: ''آپ احباب کا بہت بہت شکریہ کہ آپ جامعہ میں تشریف لائے اور مجھ خاکسار کی دعوت کو قبول کیا۔پھر از راہِ محبت فرمانے لگے کہ سب سے پہلے میٹنگ ہال میں تشریف لائیں تاکہ تواضع ہوجائے اور بعد میں کانفرنس پنڈال میں تقریب سعید کے لیے جائیں گے۔''

پروفیسر عبدالجبار شاکر فرمانے لگے کہ ''حضرت ہم راستے میں کھاتے اور پیتے ہوئے اور شعر و شاعری سے پیٹ بھرتے آئے ہیں۔چوں کہ تقریب ظہر سے عصر تک محدود وقت کے لیے ہے ہمیں اس تقریب میں جانا چاہیے۔کھانا وغیرہ بعد میں ہوجائے تو بہتر ہے۔''

تقریب کی کارروائی شروع تھی۔یہاں علماء و فضلائے جامعہ کے علاوہ خطیب پاکستان مولانا محمد حسین صاحب شیخوپوری (رحمہ اللہ) بھی رونق افروز تھے۔فیصل آباد کے مدارس کے اساتذہ اور کئی طلباء و علمائے کرام بھی شریک مجلس تھے۔سب سے پہلے لاہور سے شریک ہونے والے احباب دانش میں سے جناب سعد صدیقی صاحب نے خطاب فرمایا اور بعد میں جناب حافظ صلاح الدین یوسف صاحب، جناب علیم ناصری رحمہ اللہ اور مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ کے خطابات ہوئے۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب کو خطاب کی دعوت دی گئی۔انھوں نے بڑا جامع اور روح پرور مقالہ اس تقریب کے سامعین کے گوش گزار کیا۔ اس کا ایک اقتباس نظر قارئین ہے۔

''الجامع الصحیح البخاری'' میں دنیا کا اعلیٰ ترین علم موجود ہے۔دنیا میں اس علم سے قبل علم تورات، علم زبور وغیرہ تھے۔مگر اس کتاب میں علم الحدیث

تو ہے ہی مگر علم الفقہ وفقہ الحدیث صحیح بخاری شریف کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس سے پہلے کتب حدیث کی بایں انداز ترتیب نہ ہوتی تھی مگر اس کتاب میں حضرت امام رحمہ اللہ نے فقہی مسائل کو ایسی جدید ترتیب اور تفسیر کے ساتھ محفوظ کر دیا ہے کہ بعد میں آنے والے محدثین نے انھی کی طرز اور ترتیب کو اپنایا۔ دشمنانِ اسلام نے ہزار کوششیں کیں کہ علم الحدیث کو ختم کر دیا جائے مگر اللہ کے فضل سے اب تک وہ ناکام ہیں اور آئندہ بھی ناکام رہیں گے۔ الحمدللہ آج یہ دین دنیا کے ۲/۱/۱۲ لاکھ مربع میل کے علاقہ میں پھیل چکا ہے۔ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے پوری عمر علم حدیث کی خدمت میں صرف کی اور چھ لاکھ احادیث میں سے بغیر تکرار چار ہزار سے زائد کا انتخاب فرمایا۔ ان شاء اللہ یہ علم نسلاً بعد نسلٍ قیامت تک طالب علموں کے سینوں میں منتقل ہوتا رہے گا۔'' اس تقریب میں آخری خطاب خطیب پاکستان مولانا محمد حسین شیخوپوری رحمہ اللہ کا ہوا تھا۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر مرحوم جہاں ایک عالم دین، مدبر، دانش ور اور خطیب تھے وہاں ایک مرنجاں مرنج اور میٹھی طبیعت کے انسان تھے۔ یبوست اور روکھا پن ان سے کوسوں دور تھا۔ عام مجلس میں بھی کام کی باتیں کرتے تھے۔ اس تقریب سے جب ہم لاہور کے لیے روانہ ہوئے تو رات بارہ بجے کا وقت تھا۔ حضرت ندوی حفظہ اللہ نے بڑا اصرار فرمایا کہ رات ہمارے ہاں رہیں۔ علی الصبح لاہور روانہ ہو جانا مگر سب ساتھی واپس لاہور آنا چاہتے تھے۔ واپسی پر فرنٹ سیٹ پر جناب پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ بیٹھے تھے۔ باقی احباب دیگر سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ راستے میں سمندری ضلع فیصل آباد کے نزدیک جب گاڑی پہنچی تو رات کے نو بج چکے تھے اور ناکے پر موجود کانسٹیبل نے گاڑی کو رکنے اور چیک کرنے کا اشارہ کیا۔ جناب شاکر صاحب نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے شیشہ نیچے کر کے کانسٹیبل کو کہا، ''بھائی السلام علیکم! میں پنجاب پبلک لائبریریز کا ڈائریکٹر ہوں۔ عبدالجبار شاکر نام ہے اور ماموں کانجن کی کانفرنس سے فارغ ہو کر لاہور واپس جا رہے ہیں۔'' کانسٹیبل نے شاکر صاحب کو سلیوٹ کیا اور گاڑی جانے کے لیے اشارہ کیا۔

لاہور سے جاتے ہوئے تمام سفر میں علمی لطائف اور علامہ اقبال کے شعروں سے تمام احباب دل بہلاتے ہوئے گئے۔ شیخوپورہ کی حدود میں گاڑی داخل ہوئی تو صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ اور تمام احباب بتی چوک شیخوپورہ میں مولانا حافظ عبداللہ شیخوپوری رحمہ اللہ کی مسجد میں چلے گئے تاکہ باجماعت نماز فجر کی ادائیگی ہو سکے۔

جناب حافظ عبداللہ شیخوپوری (رحمہ اللہ) نے جب اہل علم و دانش کو اپنی مسجد میں دیکھا تو انھیں بڑی خوشی ہوئی۔ جماعت کروانے کے لیے انھوں نے مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب سے گزارش کی۔ انھوں نے پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب سے درخواست کی، مگر سب نے انکار کیا۔ حافظ عبداللہ صاحب نے جماعت کروائی۔ نماز کے بعد مولانا شیخوپوری صاحب نے ٹھنڈی بوتلیں منگوائیں اور فرمانے لگے کہ تمام احباب ناشتہ بھی یہیں کریں گے۔ فوراً اپنے بیٹے سے فرمانے لگے، آج میری مسجد میں بڑے بڑے صحافی اور بڑے بڑے ادیب تشریف لائے ہیں۔ دیسی بکرے کے پائے کا ناشتہ لے کر آؤ۔ مگر تمام احباب نے بوتلوں پر اکتفا کیا۔ سفر کی تکان کے علاوہ رات کی نیند سے بھی سب کی آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں۔ اس لیے مسجد سے نکل کر لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ شاکر صاحب شیخوپورہ ہی میں اپنی رہائش گاہ پر چلے گئے۔ باقی حضرات بعافیت لاہور آ گئے۔

اللہ کریم مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، ان کے درجات بلند فرمائے اور موجودین کے علم و عمل میں برکت دے۔

آمین یا ربّ العالمین



آہ! پروفیسر عبدالجبار شاکر آج ہم میں نہیں

ڈاکٹر محمد یوسف فاروق (ماڈل کالونی، وزیر آباد)

پروفیسر عبدالجبار شاکر آج ہم میں نہیں لیکن ان کی یاد ان کے چاہنے والوں، شاگردوں اور ان سے فیض پانے والوں کے دلوں میں مدتوں رہے گی۔ وہ دور حاضر کے ان معدودے چند اصحابِ علم میں سے تھے جن کے علم نے ان کے مزاج اور دماغ کو خراب نہیں کیا۔

سرخ وسفید رنگت، روشن اور متجسس آنکھیں، سفید براق داڑھی، سر پر قراقلی کی عمدہ ٹوپی، میانہ قد لیکن ایک نہایت قدآور شخصیت جسے لوگ پروفیسر عبدالجبار شاکر کے نام سے جانتے تھے۔ ایک بہت بڑے عالم، ایک شفیق استاد، ایک دلِ دردمند رکھنے والے مسلمان، ایک محقق، معلم، مقرر اور ایک بلاشبہ عظیم انسان پلک جھپکتے میں دنیا چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ایک عرصہ سے مرضِ دل کے ہاتھوں پریشان تھے۔ لیکن ان کے چہرے بشرے سے کبھی ان کے دل کی حالت کی غمازی نہیں دیکھی۔ وقت آخر تک علالت کو اپنے معمولات پر حاوی نہیں ہونے دیا اور کسی بھی طرح سے کسی کے دست نگر نہیں ہوئے۔ بے شک یہ سب اللہ پر پکے ایمان کی نشانیاں ہیں۔

استاد تو وہ اردو کے تھے لیکن عربی، فارسی، دینیات، فلسفہ اور تاریخ کے چلتے پھرتے انسائیکلوپیڈیا تھے۔ مسجد میں دعوت وتبلیغ کی مجلس ہو یا ایوانِ اقبال میں یوم اقبال کی تقریب، انھوں نے ہمیشہ کلمۂ حق کہا اور حق گوئی کا حق ادا کیا۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب یومِ اقبال کی تقریب میں مشرف دور میں تاریخی حوالوں سے ایک زوردار تقریر کی جس میں ثابت کیا کہ روزِ اوّل سے ہی چھاؤنیوں سے سول حکومتوں سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی ہے۔

وہ سرکاری ملازم ہوکر بھی سرکاری غلام نہ تھے۔ ایک آزاد انسان تھے، آزادی پسند تھے اور صحیح معنوں میں ایک آزاد ملک کے آزاد شہری تھے۔ ان کا طرزِ تخاطب اتنا منفرد کہ اہل زبان ان کے آگے پانی بھرتے تھے۔ الفاظ ان کی زبان کے غلام اور خیالات ان کی جیب کی گھڑی، جب تک تقریر کرتے کسی کو اونگھ نہیں آسکتی تھی بلکہ سننے والا ان کے دلائل اور خوب صورت الفاظ میں کھو جاتا تھا اور خواہش ہوتی کہ ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

کتابوں کے رسیا اور پھر ڈائریکٹر لائبریریز بنا دیے گئے۔ جس کسی نے انھیں اس عہدہ کے لیے چنا، صدآفریں اس کی پسند پر! حق دار کو حق دیا گیا۔ کتابوں سے عشق اس قدر کہ عمر بھر کی پونجی بلکہ اس میں بظاہر کئی اور پونجیاں ملا کر بیت الحکمت کی لائبریری قائم کی۔ جس میں کتابوں کی ترتیب وترکیب منفرد ہے۔ تفاسیر القرآن کا اتنا بڑا مجموعہ اور قلمی مخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ پرائیویٹ سیکٹر میں شاید ہی کسی اور کے پاس ہو؟ آج وہ کتابیں اور لائبریری اپنے خالق کی منتظر ہوں گی لیکن وہ تو وہاں چلا گیا جہاں سے واپس کوئی نہیں لوٹا!

وہ ایک عظیم استاد، عالم باعمل، محقق اور سب سے بڑھ کر ایک نہایت پیارا انسان آج ہم میں نہیں۔ چلو ان کی مغفرت اور بلندیٔ درجات کے لیے ہاتھ اٹھائیں کہ ربِّ جلیل کے خزانہ میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ **اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ**

یہ چند الفاظ لکھنے بیٹھا تھا، پتا چلا کہ اردو کہ شہرہ آفاق استاد بلکہ استاد الاساتذہ ڈاکٹر وحید قریشی بھی اپنے عزیز شاگرد کے پیچھے پیچھے اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ بے شک ان دو ہستیوں کا اس علمی زوال پذیر معاشرہ سے اٹھ جانا ایک بہت بڑا نقصان اور علمی سانحہ ہے اور یہ خلا اتنا بڑا ہے کہ بظاہر پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ لوگ آتے اور جاتے ہیں لیکن انسانوں کی ہر دور میں ضرورت رہی اور وہ ہمیشہ کمیاب ہوتے ہیں۔

اللہ عزوجل سے دعا ہے کہ وہ ہمارے ان دونوں بزرگوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ان کی بشری لغزشوں کو اپنی رحمت سے حسنات میں بدل کر انھیں اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے، آمین   ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

پروفیسر عبدالجبار شاکر

عطا محمد جنجوعہ

پروفیسر عبدالجبار شاکر دعوت اکیڈمی اسلامی یونیورسٹی کے ڈائریکٹر اور فیصل مسجد اسلام آباد کے خطیب تھے۔ وہ بلند پایہ دانش ور تھے جن کو اللہ نے تدریس، تحریر وتقریر کے فن سے نوازا ہوا تھا۔ اسلامی، تاریخی خصوصاً سیرت طیبہ پر ہزاروں کی تعداد میں نایاب کتب اُن کی ذاتی لائبریری کی زینت بنی ہوئی تھیں جو اُن کے علم سے لگاؤ اور وسیع مطالعہ کے ذوق کی عکاسی کرتی ہیں۔

وہ بیک وقت دینی ودنیوی علوم سے بہرہ ور تھے۔ وہ اسلامی وقومی مسائل اور چیلنجز پر بحث ومباحثہ کے دوران اپنا موقف سنجیدہ اور مدلل انداز میں پیش کرتے تھے۔

سیرت طیبہ پر سیمینار ہو یا بزم اقبال و یوم آزادی کی قومی تقریبات ہوں پروفیسر صاحب کو ماہرانہ صلاحیت کی وجہ سے ضرور مدعو کیا جاتا تھا۔ اُن کا خطاب مقررین میں سے امتیازی حیثیت کا حامل ہوتا۔

شیخ الحدیث مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کی یاد میں الاعتصام نے خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جس کی تقریب میں پروفیسر صاحب کی تقریر پہلی دفعہ سننے کا اتفاق ہوا۔ دوسری دفعہ فہم القرآن سیمینار میں ان کا علمی خطاب سننے کا موقع ملا۔

یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو حکیم عبدالعزیز کے گھر پیدا ہوا جس کا نام سید عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کی نسبت سے عبدالجبار رکھا گیا۔ اُن کے خطاب میں روحانیت، لطافت، فکر وبصیرت اور علمی وتحقیقی انداز بیان خاندانِ غزنویہ کا آئینہ دار تھا۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر اس روشن خیالی کے دور میں قدامت پسند اور جدت پسند طبقوں کو اعتدال کی روش اختیار کرنے پر زور دیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بنیاد پرستوں اور لبرل طبقوں میں یکساں مقبول دانش ور کے طور پر معروف رہے۔

تاہم کسی موقع پر سلفی اقدار کو نہیں چھوڑا بلکہ وہ زندگی کے آخری سانس تک امن وآشتی اور قومی مسائل کے حل کے لیے کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامنے کا درس دیتے رہے۔

۱۳/اکتوبر ۲۰۰۹ء کو اسلام آباد کے ہسپتال میں دورانِ بائی پاس آپریشن انتقال کر گئے۔ اللہ اُن کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ اور اُن کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ خصوصاً ان کے بیٹوں کو اسلام اور پاکستان کے استحکام اور ترقی میں باپ کی طرح علمی وعملی خدمت کرنے کی صلاحیت سے نوازے، آمین......!



شاکر جو سراپا تشکر تھے

حافظ احمد شاکر

عزیز دوست ڈاکٹر عبدالغفور راشد جو عہدے کے اعتبار سے مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کے ناظم طبع وتالیف ہیں (جنھیں ان کے دوست ناظم تالیف طبع بھی کہتے ہیں) کچھ عرصہ سے بعض اہل علم وفضل کے اعزاز میں تعارف وتحسین اور مقام شناسی مجالس کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اس مرتبہ انھوں نے مؤرخہ ۲۶ نومبر ۲۰۰۹ء بروز جمعرات مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کے دفتر میں مرحوم مغفور شاکر صاحب کے لیے ایک تعزیتی مجلس کا اہتمام کیا تھا جس کی صدارت امیر محترم جناب ساجد میر صاحب نے فرمائی تھی۔ اس مجلس میں مرکزی جمعیت کے چیدہ چیدہ راہ نماؤں اور خطباء نے شرکت فرما کر مرحوم کو خراج تحسین پیش کیا تھا راقم کو بھی جناب ''ناظم تالیف طبع'' نے شرکت کی دعوت اور اظہار خیال کا حکم دیا تھا۔ ذیل کی چند سطریں اسی مجلس کے لیے لکھی گئی تھیں۔ قلت وقت کی بنا پر انھیں پڑھا تو نہیں جا سکا وہاں مختصر ترین زبانی اظہار پر ہی گزارا کیا۔ اب خیال ہوا کہ ان وقیع مضامین میں یہ بھی طبع ہو جائے اس لیے پڑھتے وقت اس وقت کی ضرورت پیش نظر رہے۔ [احمد شاکر]

مختلف احادیث مبارکہ میں وارد بعض دعاؤں میں بندے کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے عمر بڑھنے کی بعض دعاؤں کا ذکر جب پڑھنے میں آیا تو اپنے اساتذہ کرام رحمہم اللہ سے تقدیر کے متعلق سوال کیا کہ عمر وغیرہ تو لوح محفوظ میں لکھی جا چکی ہے تو پھر برکت کی یہ دعا کیسی؟ اساتذہ نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ انسان کی لکھی ہوئی عمر میں بایں انداز برکت ہو جائے کہ وہ اپنی عمر طبعی میں زیادہ سے زیادہ امور خیر سرانجام دینے کی توفیق سے بہرہ یاب ہو جائے۔ اس حدیث پاک کے مفہوم کی روشنی میں محترم پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو واقعتاً ان کی زندگی بہت بابرکت تھی۔ راقم کو کم وبیش ربع صدی یعنی ۲۵ سال سے ان کا نیاز حاصل تھا۔ اس عرصہ میں ان کو کبھی فارغ بیٹھے، دوسروں پر تبصرے کرتے یعنی غیبت کرتے، گپیں ہانکتے، اظہار تعلّی کرتے، لطیفہ بازی کرتے اور لایعنی گفتگو کرتے نہیں دیکھا۔ اس وقت بھی اندازہ ہوتا تھا لیکن اب ان کے حالات وواقعات پڑھ کر اس کی تصدیق ہو گئی کہ انھیں ذکر واذکار سے طبعی شغف اور علم سے عشق تھا۔ اخذ وضبط کا حصہ بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو وافر عطا کیا ہوا تھا۔

اس کا ذکر تو خیر ان کے مزاج ہی کے خلاف تھا لیکن ان کی محتاط گفتگو سے مترشح ہوتا تھا اور اب ان کی شب وروز کی مصروفیات پریس میں آ جانے نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ وہ شب زندہ دار بھی تھے۔ شب زندہ داری اللہ تعالیٰ کی اپنے خاص بندوں پر خاص ہی عطا ہوتی ہے۔ اور کسی کے بارے میں علم نہیں لیکن مجلس میں موجود ہمارے ممدوح اور محبوب جہانِ علم مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ بھی اس نعمت سے بتوفیقہ تعالیٰ سرفراز ہیں۔ یہ یقیناً آخری پہر کی برکات ہیں کہ پروفیسر شاکر مرحوم اس مختصر سی زندگی میں اپنے بچوں اور بچیوں کی دینی، علمی اور اخلاقی تربیت بھی کرتے رہے، سرکاری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ بھی ہوتے رہے اور غیر ممالک کے علمی دورے بھی کرتے رہے۔ وہ ملک وبیرون ملک ادبی، علمی، اقبالیات اور سیرت مبارکہ پر خطبات دیتے اور مقالات پڑھتے رہے اور ان ممالک سے اپنے پسندیدہ موضوعات کی کتب خرید کر توشۂ بیت الحکمت بھی بڑھاتے رہے۔

اب کئی سال سے وہ خالص علمی ومسلکی تقریبات میں شرکت بھی کرتے۔ اور اپنے بھرپور علمی وادبی خطاب سے ان مجالس کے حسن ووقار میں

اضافہ فرماتے اور زبان وادب کی لطافتوں سے سامعین کو مستفید بھی فرماتے۔

ایسے ہی کئی سال پہلے ایک مجلس میں انھوں نے ذاتی یعنی گھریلو اخراجات کی تفصیلات بتا کر حیران کر دیا کہ وہ کس طرح احتیاط، جزرسی اور وقار کے ساتھ ایام حیات گزارتے رہے۔ حیات مستعار کے دن گزارتے تو سب ہی ہیں لیکن ان حالات پر مطمئن ہونا اور مطمئن رہنا اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا اللہ اللہ بقول جگر ع اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔

ایسے ہی ان کا لباس ہمیشہ اجلا، یکساں اور باوقار دیکھا۔ میرے علم کی حد تک سفر وغیرہ میں بھی ان میں نہ افسرانہ تمکنت ہوتی تھی اور نہ ہی زندگی میں ان کی کسی کے ساتھ معاصرانہ چشمک۔ کھانے پینے میں انھیں جو پیش کیا جاتا وہ شوق، خندہ روئی اور بصد تشکر وامتنان قبول فرماتے۔ ان کے بچے جب زیر تعلیم تھے تو ایک دن فرمانے لگے کہ میں نے اپنے بچوں کے نام مشاہیر اسلام پر رکھے ہیں اور ان سے کہوں گا کہ وہ اپنے اپنے نام کی لاج کم از کم اتنی ضرور رکھیں کہ نام رکھی ہوئی شخصیت کی تصنیفات جمع بھی کریں اور پڑھیں بھی۔

ایسے ہی ایک دن فرمانے لگے کہ میری بچیاں کالج پڑھنے جاتی ہیں تو دوسری بچیوں کو پردہ کی تبلیغ کرتی ہیں اور جب کوئی بچی پردہ کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اس بچی کے لیے برقعہ بھی پیش کرتی ہیں۔

اہل علم سے ان کی والہانہ و نیازمندانہ عقیدت اور طلبائے علم و تحقیق سے ان کی شفقت کے واقعات تو بہت سے احاطۂ تحریر میں آ چکے ہیں اور ابھی مزید آئیں گے لیکن ان کی عبادت و ریاضت، قناعت و توکل، ذہانت و فطانت، فہم و ذکاء، گھریلو و حکومتی ذمہ داری اور وعدے کی پاسداری ایسی صفات ہیں جن کا انھوں نے کبھی اظہار تک نہیں کیا تھا۔

المکتبة السلفية، ہفت روزہ الاعتصام اور دار الدعوة السّلفیہ سے ان کا تعلق غیر معمولی تھا کیوں کہ انھیں ادارہ کے مؤسس مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ سے والہانہ عقیدت تھی اور ان کے ہی حوالے سے وہ راقم الحروف سے بہت ہی شفقت اور مروّت کا سلوک فرماتے تھے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ ہمارے خاندان کے بعض حضرات کے استاذ ہیں اور میری نیازمندی کا حوالہ خاندانی تلمذ ہی کا تعلق ہے۔ لیکن افسوس اس کی تفصیلات نہ کبھی وہ بتا سکے اور نہ ہی اس کی تفصیلات پوچھنے کا اپنے دل میں خیال آیا۔

المکتبة السّلفیہ، الاعتصام اور دار الدعوة السّلفیہ میں جب کبھی یاد کیا تو انھوں نے بصد خوشی شرکت کر کے ہماری حوصلہ افزائی فرمائی اور محفل کو رونق بخشی، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ طلباء، ہم عصر علماء اور اپنے ہم عمر اہل علم سے ان کا تعلق تنقید و تعریض اور تنقیص کی بجائے شفقت اور حوصلہ افزائی کا ہوتا جو بہت ہی کم اہل علم حضرات کے حصہ میں آتا ہے۔

بیت الحکمت ابھی ابتدائی مرحلے میں ہی تھا تو فرماتے تھے کہ بیت الحکمت میں دنیا بھر سے کتب حدیث کا ذخیرہ اکٹھا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ اصل دین حدیث مبارک ہی سے سمجھ آتا ہے اور یہ خدمت کسی اہل حدیث ہی کو کرنی چاہیے۔ بعض دیگر بیوروکریٹس کی طرح انھوں نے اپنے مسلک و عقیدہ کو چھپایا نہیں اور نہ کبھی معذرت خواہانہ انداز اپنایا۔ ہاں البتہ مسلک پر اپنی رائے سلیقہ و طریقہ اور یقین و دلیل کے ساتھ بیان کر کے ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة کا انداز اختیار فرماتے۔ علم، عقیدہ کے بارے میں ان کی رائے پختہ اور مضبوط ہوتی تھی لیکن اظہار اس کا ہمیشہ نرم، شیریں اور بغیر کسی ادعا کے فرمایا کرتے تھے۔



آزاد مگر مجبور پاکستان

اے وطن! ہمارے خون سے رنگین ہے داستان تیری
تو اَن گنت قربانیوں کا حاصل ہے، یہ حقیقت دنیا پہ ہے عیاں تیری
قائد اعظم کی وسعت نظری اور جہد مسلسل کی دلیل ہے تیرا وجود
شاعر مشرق کے پیش کردہ نظریہ پاک کی تکمیل ہے تیرا وجود
تو وجود میں آ تو گیا، مگر بھاری قیمت چکانے کے بعد
تجھ پر قدم رکھنا نصیب ہوئے متاع حیات لٹانے کے بعد
وہ خونیں منظر جس سے گزر کر ہم تیری طرف کلمہ توحید پڑھتے چلے آئے
اِک آگ اور خون کا سمندر جسے عبور کرکے سوئے منزل بڑھتے چلے آئے
آج بھی جب نگاہ کے سامنے سے گزرتا ہے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے
آنکھیں اشک بار ہوجاتی ہیں، دل خوف سے تھرانے لگتا ہے
وہ منظر کیا تھا، اک قیامت صغریٰ تھی، اس سے ذرا بھی کم نہ تھا
اپنی جان کی فکر تھی سب کو، کسی کو بھی دوسرے کے مرنے کا غم نہ تھا
تیری چاہت کے جرم میں معصوم جانوں کو سنگینوں تلے تڑپایا گیا
شیر خوار بچوں کو ماؤں کی گود سے چھین کر نیزوں کو انیوں پر لٹکایا گیا
شمشیریں چلتی دیکھیں، گردنیں کٹتی دیکھیں، ہر طرف تڑپتے لاشے دیکھے
چشم فلک نے بھی زمیں پر ہونے والے یہ خونیں تماشے دیکھے
یہ تھے وہ حالات جن سے گزر کر ہم نے اپنے گلے لگایا تجھ کو
مگر حیف! نصف صدی گزرنے پر بھی مستحکم و مضبوط نہ پایا تجھ کو
اب تیری ہی سرزمیں پر، تیرے باسی، بے وطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں
ادھر ہم ہیں کہ دشمن کی عیارانہ پالیسیوں کو سمجھنے سے معذور ہیں
دشمن ابتدا سے ہی تیرے درپے ہے، وہ تیرے وجود کا قائل نہ تھا
اسلام دشمنی طینت میں ہے اس کی، آزادی مسلماں کی طرف وہ مائل نہ تھا
ابھی تو ہم تیرے قیام پر لگنے والے زخموں کو بھلا نہیں پائے ہیں
کہ ایک بار پھر ہمارے سروں پر آزمائش کے بادل چھائے ہیں
یہ آزمائشیں یوں ہی آتی رہیں گی، ہم ان سے نجات پاسکتے نہیں
تاوقتیکہ دو قومی نظریے کی گہرائی تک خود کو لے جا سکتے نہیں
قرآنِ مقدس سے واضح ہے کہ کافر تمہارے ہمدرد وغمخوار ہو نہیں سکتے
لاکھ دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ تم، یہ تمہارے یار ہو نہیں سکتے

[محمد اسحاق عابر، ملتان]